لاطینو
لاطینی امریکہ بارے اردو زبان کا پہلا سفرنامہ
عامر بن علی

لاطینو

لاطینی امریکہ بارے اردو زبان کا پہلا سفرنامہ

عامر بن علی

لاطينو

لاطينو

لاطينو

لاطينو

انتساب

پابلو نرودا کے نام!

جن کی شاعری کے ہسپانوی متن سے براہ راست اردو ترجمہ کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا

ترتیب

سرِ آغاز۔۔۔۔۔۔۔۔۔عامر بن علی

حصہ اول

محبت کا کوئی گیت ہے یہ سپنوں کی سرزمین

1۔ میکسیکو شہر۔ دھنک رنگ نگری
2۔ محبت کے خطوط
3۔ سرحد کے اس پار
4۔ لیون ٹراٹسکی کا گھر
5۔ فریدہ کا نیلا آستانہ
6۔ لیما کی ایک نمائش
7۔ پیرو کا تکنا
8۔ ارجنٹائن۔ خوابوں جیسی حسین سرزمین
9۔ حلال کوشر
10۔ مے کدے کا سبق
11۔ کولمبیا۔ امن و خوشحالی کا منتظر
12۔ کیا ہوئے وہ سوداگر جو رونق بازار تھے
13۔ اک بستی دور افتادہ۔ پیکا
14۔ سمندروں کے سفر پہ نکلو

15۔ تاراپا کا گاؤں

16۔ احتجاج کے لاطینی طریقے

17۔ چلی میں کرسمس اور نیا سال

18۔ لاتیرانا کا عرس

19۔ ہمبرسٹون

20۔ آئن سٹائن کی تکریم

21۔ اک وبا کے پھیلاؤ کا آنکھوں دیکھا حال

22۔ جاپانیوں کی دیانتداری پر لاطینی تبصرے

23۔ سال نو کے مناظر

24۔ زندگی کا سرچشمہ

25۔ چلی میں چند روز

26۔ 11 ستمبر ایک اور بھی ہے

27۔ کیا وہ قتل کیا گیا؟

28۔ ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

29۔ ایسا منظر نہیں دیکھا

30۔ نرودا کے حضور

31۔ سنتیاگو کی ایک صبح

32۔ شاعروں اور ادیبوں کا وطن

33۔ فٹ بال کا قدیم ترین ٹورنامنٹ

34۔ پابلو نرودا کے آنگن میں ایک دوپہر

35۔ لاس بیردیس

36۔ لاطینی امریکہ کی پہلی نوبل انعام یافتہ خاتون

37۔ دوہری شہریت کا دوسرا رخ

38۔ ویسٹ انڈیز میں کیا دیکھا

39۔ محبت کے دو رنگ

40۔ ٹیکساس نامہ

41۔ جزائر ہوائی

42۔ ہوائی باتیں

43۔ تاریخ ساز امریکی انتخابات

44۔ برازیل کا طلسم ہوشربا

حصہ دوم

کتاب سے برتر کوئی جلیس نہیں

45۔ انسان کی تاریخ

46۔ نقش فریادی ہمارے عہد میں

47۔ سخن ور کا سفرنامہ

48۔ قوس قزح کے رنگوں سے مزین تخلیق کار

49۔ چڑھتے سورج کی سرزمین کا ذکر

50۔ گمنام ہیروز کے نام

51۔ فارسی ادب کے سات سورما

سرِ آغاز

لاطینی امریکہ کی طرف کم کم ہی ہم دیسی لوگوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔اوران آنے جانے والے لوگوں میں اہل قلم کی تعدادمزید کمتر ہے۔شایداسی پس منظر کے سبب اردوقارئین کے لئے آج تک اس خطۂ ارض کے متعلق کوئی سفرنامہ تحریر نہیں کیاجاسکا۔سب سے پہلے تولاطینی امریکہ کی اصطلاح کی وضاحت پیش کرنا برمحل ہوگا کہ یہ کوئی فقط جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ لسانی وثقافتی ترکیب ہے۔براعظم شمالی اورجنوبی امریکہ کے وہ ممالک جن کےعوام کی غالب اکثریتی زبان کا ماخذ ومصدر لاطینی زبان ہے ان کوعموماً لاطینی امریکہ کہاجاتاہے۔ان میں ہسپانوی اور پرتگالی دوبڑی زبانیں ہیں۔ویسٹ انڈیز میں انگریزی بولی جاتی ہے مگرارد گرد کے جزائراور خطے میں لوگوں کی باہمی آمدورفت کے باعث اسے میں نے رودادسفرمیں شامل کرلیا ہے۔جہاں تک امریکہ کاتعلق ہےتو ٹیکساس کبھی میکسیکوکا حصہ تھا،پھرآزادملک کے طور پربھی اس کاوجودکئی برس تک برقراررہااوراس سے پہلے یہ سپین کی نوآبادی ہونے کےسبب ہسپانوی زبان بولنے والی ریاست تھی۔اس لئے اسے شامل کرناتو میرٹ پرآتاہے،مگرریاست ہوائی کی بدعت یوں درآئی کہ پورےامریکہ میں ہی اب ہسپانوی دوسری بڑی زبان ہے،یوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کواس میں شامل نہ کرناتعصب برتنے کےمترادف ہوگا،لیکن یہ شرکت بڑی محدود ہے کہ وہ لاطینی امریکہ سے مختلف مزاج کا حامل دیس ہے۔اس سفرنامے میں میرامرکزی نقطۂ نگاہ بہرحال لاطینی ممالک اوران کی ثقافت وسماج ہے۔اس سفرنامے کامزاج نظم کی بجائے غزل کاساہے،جس میں ہرشعرکاموضوع ومضمون الگ ہوتاہےمگرمجموعی شعری فضا یکساں ہوتی ہے۔

عامر بن علی

ٹوکیوجاپان

مارچ۲۰۲٦

حصہ اول

محبت کا کوئی گیت ہے یہ سپنوں کی سرزمیں

میکسیکو شہر۔ دھنک رنگ نگر

چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک ایسی وادی کا تصور کریں جس کے وسط میں ایک بہت بڑی جھیل ہو، اس جھیل کے مرکز میں کوئی بہت بڑا جزیرہ ہو اور اس جزیرے پر ایک شہر آباد ہو جائے تو کیسا لگے گا؟ میں طلسم ہوشربا کی کہانی کے کسی نگر کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ میکسیکو کے دارالخلافہ اور اس کے ہم نام شہر میکسیکو کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ سن 1325 عیسوی میں بسنے والے اس شہر کے اردگرد واقع جھیل تو وقت کے ساتھ ساتھ سوکھ کر ماضی کی داستان بن گئی اور شہر پھیلتا چلا گیا مگر اب بھی شہر کا جغرافیہ اور تعمیر کے زیر و بم اس جھیل کا پتہ دیتے ہیں۔ سولھویں صدی میں جب ہسپانوی فوجوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اسے مکمل طور پر تاراج کر ڈالا، اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بعدازاں شہر کی ہسپانوی طرز پر از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ یہ شہر لاطینی امریکہ میں ہسپانوی سلطنت کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ بنیادی طور پر اس شہر کو بسانے والے لوگ میکسیکا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ سپین کے قبضے میں جانے سے پہلے اس شہر کا نام کچھ اور تھا مگر ہسپانوی حکمرانوں کے لئے یہ تلفظ ذرا مشکل تھا لہٰذا انہوں نے اپنی آسانی کے لئے میکسیکا قبیلے کے لوگوں کی نسبت سے اس شہر کو میکسیکو کا نام دے ڈالا اور پچھلے پانچ سو سال سے یہی رائج چلا آ رہا ہے۔

دورانِ پرواز جہاز میں میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھی میکسیکن لڑکی نے مشورہ دیا کہ ایئرپورٹ کے احاطے سے نکلتے ہی ٹیکسی مت لے لینا بلکہ ایئرپورٹ سے ملحقہ سڑک پیدل پار کر کے دوسری جانب ٹیکسی سٹینڈ کا رخ کرنا، وہاں موجود ٹیکسی تمہیں ایک تو دس منٹ پہلے شہر کے مرکز میں پہنچا دے گی، دوسرا تمہارے آدھے پیسے بھی بچ جائیں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایئرپورٹ ٹیکسی والے

قصائی ہیں۔مقامی کرنسی کو''پیسو'' کہتے ہیں جوایک ڈالر میں تیرہ آجاتے ہیں مگر میں نے سہولت کے لئے انہیں پیسے لکھا ہے۔دوکروڑآبادی اوردنیا میں سب سے بڑے ہسپانوی زبان بولنے والے شہر پرواز پہنچی تو میں نے مذکورہ خاتون کی ہدایت کے مطابق سڑک کے اس پارٹیکسی سٹینڈ کارخ کیا،ابھی چندہی قدم ائیر پورٹ سے باہر نکلا ہوں گا کہ اتفاق سے جس پرواز سے میں یہاں پہنچا تھا،اسی پرواز کا فضائی میزبان لڑکا مجھے مل گیا۔میں نے تصدیق کے لئےٹیکسی سٹینڈ کے بارے میں پوچھا تواس نے بڑی بے تکلفی سے مجھے کہا کہ ٹیکسی کو دفع کرو،وہ سامنے کھڑی سرخ میٹروبس پکڑواور تین ڈالر،پندرہ منٹ میں قدیم شہراورمحلات کے مرکز میں پہنچ جاؤ۔یادرہے کہ میکسیکوسٹی کومحلات کا شہر کہا جاتا ہے۔میں نے سکیورٹی کے متعلق اپنے خدشات اورتحفظات کا ذکرکیا تو اس نے بتایا کہ ٹیکسی کی نسبت بس زیادہ محفوظ ہے۔ہربس میں نہ صرف پولیس تعینات ہے بلکہ پولیس کی موبائل گاڑی بھی چھوٹی بڑی سڑک کو محفوظ بنانے پر مامور ہے۔اس لئے بے فکر ہوکر سوار ہوجاؤ!!!میٹروبس کے چاروں طرف بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے،میں یہ سوچ کر بس میں سوار ہوگیا کہ ٹیکسی کی نسبت اس میں سے باہر کا منظرزیادہ واضح اور دلکش نظرآئے گا۔بس میں واقعی ایک مسلح،باوردی نوجوان براجمان تھا۔چاک وچوبند تونہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ سواریوں کے ساتھ گپ شپ میں بے حد مصروف تھا۔بس کے ہرسٹاپ پر پولیس کا ایک مسلح اہلکارموجودتھا۔کئی جگہ مسلح خواتین پولیس اہلکارڈیوٹی سرانجام دے رہی تھیں اورسڑک پر پولیس موبائل کا گشت بھی غیرمعمولی تھا۔

میکسیکوشہرکاقدیمی مرکزمجھے تو لاہور کے انارکلی بازار کی فوٹوکاپی لگا۔لوگوں کی گہما گہمی۔دکانوں کا سائزاورگاہکوں سے بھاؤ تاؤ،عمارتوں کانوآبادیاتی طرزِتعمیر اور شاید لوگوں کی رنگت اورمعاشی حالات بھی ان وجوہات میں شامل ہوں جومل جل کر یہاں بھی ویسی ہی فضا بنارہی تھیں جوانارکلی بازار کا خاصہ ہیں۔بازار میں لگی ہوئی ٹف ٹائل اورمیٹروبس جس کا رنگ اور سائز ہی نہیں،نام تک لاہور کی میٹروبس کا مماثل ہے،اس تاثر کی وجہ ہوسکتا ہے۔میکسیکن کھانے پاکستانی کھانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔مرچ مصالحے توہماری ہانڈی کی مشترکہ اساس ہیں،مگرکمال یہ ہے

کہ یہاں روٹی کھائی جاتی ہے جو سائز میں ذرا ہم سے چھوٹی ہوتی ہے، مگر ذائقہ وہی تازہ گندم اور چولہے کی آنچ پر پکا ہوا۔ سچی بات ہے مجھے تو میکسیکن کھانے بے حد پسند آئے۔

اندرون میکسیکوسٹی گھومتے پھرتے ہوئے بالکل وہی احساس پیدا ہوتا ہے جو کبھی اندرون شہر لاہور جائیں تو آدمی محسوس کرتا ہے، تعمیر ہماری طرح اینٹوں و کنکریٹ والی ہے، جھروکے بھی ہیں، اکھڑا ہوا پلستر بھی۔ دیواروں پر ہماری طرح رنگ برنگ پینٹ کئے ہوئے ہیں۔ جس کو جو رنگ پسند آیا در و دیوار اسی سے رنگین کر دیئے، جگہ جگہ ہر طرف درخت لگے ہوئے ہیں۔ ان اشجار سایہ دار کی بدولت ہر کوچہ و بازار میں سایہ میسر ہے۔ چاہے سورج سر پر کھڑا اکڑ کڑاتی دھوپ سے شہر کو نہلا رہا ہو ہر سو، ہر جگہ سایہ ہو۔ دنیا کے کسی شہر میں کوئی شے گھنے درخت سے خوبصورت نہیں۔

لوگ بڑے زندہ دل اور لاطینی امریکہ کے باقی ممالک کی طرح رقص و موسیقی کے دل دادہ ہیں۔ کئی ساز میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہاں دیکھے اور کئی دھنیں ایسی تھیں جو پہلے کبھی سماعتوں سے نہ ٹکرائیں۔ ساٹھ سال کے پیٹے میں ایک خاتون موسیقی سے مبہوت ہو کر رقص کرنے لگتی ہے اور تھوڑی دیر میں اٹھارہ بیس سال کا ایک سمارٹ سالڑ کا سامعین کے ہجوم سے نکل کر خاتون کے ساتھ رقص میں شریک ہو جاتا ہے۔ میں آدھا گھنٹہ بازار کے ایک کونے میں جاری رقص و موسیقی کی اس محفل سے لطف اندوز ہونے کے بعد مجمع سے نکل گیا مگر محفل اسی جوش و جذبے سے جاری رہی۔ لاطینی امریکہ میں ایسی محفلیں صدیوں سے جاری ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گی۔ کچھ وضاحت بارِ دیگر لاطینی امریکہ کی اصطلاح کی بھی برمحل ہو گی کیونکہ یہ اصطلاح بظاہر جغرافیائی لگتی ہے مگر اس کی بنیاد لسانی ہے۔ یوں تو میکسیکو براعظم شمالی امریکہ میں آتا ہے مگر لسانی اعتبار سے یہ لاطینی امریکہ کا حصہ ہے جیسے کیوبا وغیرہ۔ زمانہ قدیم میں یورپ کی غالب زبان لاطینی تھی اور سلطنت روم کی سرکاری زبان ہونے کے ناتے سے اپنے عہد کی دنیا کی سب سے معتبر زبان کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لاطینی زبان سے کئی نئی زبانوں کا جنم ہوا جو کہ ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد ہسپانوی، اطالوی، رومانین فرانسیسی اور پرتگالی زبان کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہیں۔ امریکہ میں سپین کی نو آبادیات تو آزادی حاصل کرنے کے

بعد دو درجن سے زائد خود مختار ممالک بن گئے مگر پرتگال کی ساری نوآبادی برازیل کی صورت میں ایک واحد ملک ہے۔مختصر یہ کہ ہسپانوی اور پرتگالی زبان بولنے والے ممالک وباشندے جوامریکی براعظموں میں بستے ہیں، لاطینی کہلاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ امریکی براعظموں کے دیگر بیشتر ممالک لاطینی امریکہ کا حصہ کہلاتے ہیں۔

میکسیکو کی ۳۷ ریاستیں ہیں مگر میکسیکو سٹی ان میں سے کسی کا حصہ نہیں، جیسے ہمارا اسلام آباد اور ہندوستان کا دلی وفاق کا علاقہ ہے۔ یہ شہر ریاست کا دارالخلافہ ہی نہیں بلکہ سیاسی، ثقافتی، تعلیمی اور اقتصادی مرکز بھی ہے۔ میکسیکو کی کل آبادی بارہ کروڑ ہے، جس میں سے بیس فیصد لوگ اسی شہر میں بستے ہیں۔ شہر کا طرزِ تعمیر ہسپانوی اور فرانسیسی طرز کا خوبصورت امتزاج ہے۔ سپین نے تو ۱۵۲۱-۱۸۲۱ تک پورے تین سو سال حکومت کی مگر یہ فرانسیسی طرزِ تعمیر کیسے در آیا؟ اس کا جواب یوں ملا کہ انیسویں صدی کے آخر میں ایک صدر ۳۵ سال تک حکمران رہا جس نے میکسیکو شہر کو پیرس بنانے کا اعلان کر رکھا تھا۔ ہمارے ہاں تو عموماً یہ صرف سیاسی نعرہ ہوتا ہے مگر اس نے سینکڑوں عمارتیں پیرس جیسی کھڑی کر دیں۔ دو منزلہ سیاحتی بس کی چھت پر بیٹھے، شہر کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے، میں نے اپنے برابر والی نشست پر براجمان امریکی بڑھیا سے پوچھا کہ تمہیں اس شہر کی کس چیز نے اپنی جانب زیادہ متوجہ کیا؟ بغیر کسی غور و فکر کے بڑھیا نے تر نت جواب دیا کہ ''اس شہر کے رنگوں نے'' شہر کے ہر گھر اور عمارت کو اس کے مکینوں نے اپنی اپنی پسند کے رنگوں کا لباس پہنا رکھا ہے۔ کسی عمارت کا رنگ گہرا نیلا ہے، ساتھ والے مکان کے مالک نے گلابی رنگ کو در و دیوار کا لباس بنایا ہے تو اس سے ملحقہ دکان والے نے سرخ اور اس کے ہمسائے نے گہرا سبز رنگ اپنے گھر کے باہر کرنا پسند کیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا رنگ بچا ہو جو اس شہر کی کسی دیوار پر آپ کو نظر نہ آئے، اس کا مجموعی اثر یہ ہے کہ میکسیکو شہر قوسِ قزح کے رنگوں میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا رنگین مزاج شہر کم از کم میں نے دنیا میں کہیں اور نہیں دیکھا۔

محبت کے خطوط

میکسیکو شہر کا ثقافتی و سیاحتی مرکز ''پلا سادی آرٹیس'' کہلاتا ہے۔فنونِ لطیفہ چوک ،جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے، یہ عجائب گھروں اور قدیم طرزِ تعمیر کی مظہر عمارتوں کا گڑھ ہے۔مربع شکل کے اس وسیع و عریض چوک کے درمیان میں کافی بڑا سا پارک ہے،اس کے اردگرد ہر وقت لوگوں کی چہل پہل رہتی ہے۔خوانچہ فروش اپنی اپنی مصنوعات بیچنے میں سرگرداں رہتے ہیں،قانونی طور پر اس جگہ کاروبار کرنا ممنوع ہے،اسی لئے سارادن ان خوانچہ فروشوں کے ساتھ پولیس کی آنکھ مچولی چلتی رہتی ہے، جب میں چوک میں پہنچا تو پولیس آپریشن جاری تھا اور چھابہ و خوانچہ لگانے والے ادھرادھر بھاگ رہے تھے۔جو بچ گئے تھے پولیس انہیں اٹھارہی تھی۔چوک میں لوگوں کے ستانے کے لئے بنچ دھرے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک بنچ پر ''محبت نامے'' کا پوسٹر لگائے ایک لڑکی اپنی جھولی میں ٹائپ رکھے ہوئے بیٹھی چٹھیاں لکھ رہی تھی۔اس کے اردگرد لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی،اور پولیس والوں کے ساتھ اس کی کسی بات پر بحث بھی ہو رہی تھی۔مجمع پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور میں بھی چسکا لینے کے لئے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔پولیس والے اس لڑکی کو وہاں سے اٹھانا چاہتے تھے،جبکہ مذکورہ مکتوب نویس کے حق میں دو لڑکیاں تند و تیز دلائل دے رہی تھیں۔ان کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ خاتون اپنا قانونی حق استعمال کر رہی ہے، یہ تو آزادیءاظہار اور بنیادی انسانی حقوق کا معاملہ ہے، یہاں بیٹھنے کا حق اسے اس ملک کا قانون دیتا ہے، پولیس اسے یہاں سے زبردستی نہیں ہٹا سکتی۔محبت کے خطوط لکھنے والی دوشیزہ کا کہنا تھا کہ میں تو مفت میں لوگوں کو خط لکھ کر دے رہی ہوں، یہ کوئی کاروبار تو ہے ہی نہیں،اس لئے آپ مجھے یہاں سے نہیں اٹھا سکتے۔خیر پولیس نے ہار مان لی اور وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔لوگوں

نے اسے اپنی فتح سمجھتے ہوئے تالیاں بجائیں۔

میں یہ سوچ کر وہاں سے آگے چل نکلا کہ یہ بنیادی طور پر تو عرضی نویس ٹائپ کوئی خاتون ہے مگر پولیس سے بچنے کے لئے جھوٹ موٹ کہہ رہی ہے کہ وہ مفت میں پیار بھرے خط لکھ کر لوگوں کی سیوا کر رہی ہے۔ پارک کا چکر لگانے اور ہسپانوی وفرانسیسی طرزِ تعمیر کی عمارات کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں فنونِ لطیفہ محل میں داخل ہوگیا، جو کہ اس چوک کی سب سے اہم عمارت ہے،فنونِ لطیفہ محل کی یوں تو کئی چیزیں قابلِ بیان ہیں مگر مجھے سب سے زیادہ دلچسپی گزشتہ صدی کے مشہور کیمونسٹ فنکار جوڑے، عہد ساز مصورہ فریدہ اور اسکے نامور شوہر ڈیگوراویرا کے فن پاروں میں تھی۔ دونوں کیا باغ وبہار شخصیات تھیں جو عالمی سطح پر میکسیکو کی پہچان بنیں، بیسویں صدی کے فن کی داستان ان کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے،اس جوڑے نے اس وقت سوویت سوشلسٹ انقلاب کے روحِ رواں لیون ٹراٹسکی کی میزبانی کی جب اسے جوزف اسٹالن نے روس سے جلاوطن کر دیا تھا۔ اسی جلاوطنی کے دوران وہ میکسیکو میں ہی قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کا الزام اسٹالن کے علاوہ امریکی سی آئی اے نے عہد ساز ادیب اور شاعر پابلو نرودا کے سر دھرا تھا، حقائق کا تجزیہ کریں تو میرے خیال میں یہ الزامات جھوٹے اور من گھڑت تھے۔ ڈیگوراویرا کے فن پارے نیو یارک کے راک فیلر سنٹر سے اس وقت ہٹا دیئے گئے تھے جب اس نے بالشویک انقلاب کے بانی ولادیمیر لینن کی مشہور زمانہ پینٹنگ بنائی تھی۔ فن کدے سے باہر نکلا تو ایک بار پھر محبت نامے لکھنے والی لڑکی کی جانب چل دیا، کہ دیکھوں تو سہی اس مفت خدمت کے ڈھونگ کی حقیقت کیا ہے، معاملے کی اصل نوعیت کیا ہے؟

پریم پتر لکھنے والی خاتون سے جا کر میں نے سیدھا سوال کیا کہ وہ خط لکھنے کے کتنے پیسے وصول کرے گی؟ دوشیزہ نے مجھے یہ کہہ کر حیرت میں مبتلا کر دیا کہ ''بالکل مفت''!! تمہیں بس اپنے پیار کی کہانی مجھے سنانی ہوگی!! خط لکھنے کا میں کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتی ہوں۔ یہ سن کر میں اس کے پاس رکھے بنچ پر بیٹھ گیا۔ سیاں جی کے نام چٹھی لکھوانے کے لئے نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد اپنی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رسمی تعارف ہوا تو اس نے اپنا نام ملیریا بتایا، میں نے کہا!! ملیریا تو

ہمارے ہاں ایک موذی مرض ہے، یہ کیسا نام رکھ دیا تمہارے والدین نے تمہارا؟اس پر وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی،اور کہنے لگی یہ ''مالے ریا'' ہے!!ملیریا تو یہاں بھی ایک بیماری ہی ہے۔خجالت مٹانے کے لئے میں نے کہہ دیا کہ میں مذاق کر رہا تھا،جس پر سبھی لوگ ہنس پڑے۔پولیس کے ساتھ بحث کرنے والی دیگر دونوں لڑکیاں پیشے کے اعتبار سے وکیل تھیں،انتظار کی قطار میں بیٹھے دیگر عاشقان کی طرح وہ بھی محبت میں مبتلا اوراس سے مفت پیار کا خط لکھوانے کے لئے یہاں براجمان تھیں۔انہی نے مجھے یہ آ گاہی بخشی کہ میکسیکو کی پولیس دنیا میں سب سے زیادہ کرپٹ ہے، جوکہ میرے خیال میں مبالغہ آرائی ہے،یہی دعویٰ پنجاب پولیس کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے۔

نامہ نویس خاتون سے میں نے کہا کہ ملکوں ملکوں گھوم چکا ہوں مگر ایسا تجربہ کبھی کہیں نہیں ہوا،محبت نامے تحریر کرنے کا ایسا اچھوتا خیال کیونکر آیا؟ جواب بہت ہی دلچسپ تھا، بتانے لگی کہ میں سنتی رہتی تھی کہ اس شہر سے سچی محبت اب ختم ہوگئی ہے،مادہ پرستی کا دوردورہ ہے،لوگ عاشقی بھول گئے ہیں، پیار اب ماضی کا قصہ ہوگیا ہے۔ میں ادب کی طالب علم رہی ہوں اور چھوٹی موٹی مصنف بھی ہوں، میں محبت کی ترویج کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔میرے پاس یہ پرانا ٹائپ رائٹر پڑا تھا،دیکھنے میں چھوٹا سا ہے لیکن بڑے خاصے کی چیز ہے،اس جیسے کلاسیکی ٹائپ رائیٹر دنیا بھر میں صرف پچاس باقی بچے ہیں۔بس میں نے عشق اور اہلِ عشق کے لئے ٹائپ رائیٹر سنبھالا اور یہاں آ کر بیٹھ گئی، میں پریمیوں سے ان کی پریم کتھا سنتی ہوں اور پھر اپنے الفاظ میں اسے ایک ادبی رنگ سے تحریر کرکے محبت نامے کا روپ دیتی ہوں، جو اہلِ دل اپنے محبوب یا محبوبہ کے نام لکھواتے ہیں۔میرے خیال میں تو یہ صدقہ جاریہ ہے۔میں نے پوچھا!! بھلی مانس!اس کام کا کوئی محنتانہ تو تم وصول نہیں کرتی، پھر کھاتی پیتی کہاں سے ہوتم؟ کہنے لگی ان مکاتیبِ عشق کی تحریر کے لئے میں نے بدھ کا دن مخصوص کرر کھا ہے، باقی دنوں میں دنیاداری کرتی رہتی ہوں۔

دنیا کے دیگر مما لک میں بیٹھ کرآ پکو یہ باتیں عجیب اور شاید کہانی سی لگے،مگر لاطینی امریکہ ایسا ہی ہے،محبت کے رنگ میں گوڑھا رنگا ہوا،موسیقی میں ڈوبا،رقص میں مبتلا اورآرٹ کا دل دادہ۔ یہ ملک

بارہ کروڑنفوس پر مشتمل،آبادی کے اعتبار سے گیارھویں اور رقبے کے اعتبار سے اقوام عالم میں چودھویں نمبر پر کھڑا ہے، گولڈ مین ساچے کے مطابق سن 2050ء تک ،میکسیکو دنیا کی پانچویں بڑی معاشی قوت بن کر ابھرے گا۔ بین الاقوامی سطح پر معیشت کا مسابقتی تجزیہ یقیناً درست ہی ہوگا،مگر یہاں آکرمحسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور ہی دنیا کوئی اور ہی سیارہ ہے، باقی عالم سے اس جہان دیگر کا بھلا کیا لینا دینا ہوسکتا ہے۔

سرحد کے اس پار

یہ ''تی خوانا'' ہے، امریکہ اور میکسیکو کا سرحدی شہر۔ تی خوانا کا ائیر پورٹ امریکی ریاست کیلی فورنیا کی سرحد سے بالکل ملحقہ واقع ہے۔ ائیر پورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے آپ کو کیلی فورنیا کا براؤن فیلڈ میونسپل ائیر پورٹ صاف نظر آتا ہے۔ ہالی وڈ کی فلموں کے ذریعے جو اس شہر کا تعارف اب تک ہوا تھا اس میں تو یہاں صرف ڈرگ لارڈ اور جرائم پیشہ افراد ہی ملتے ہیں اور مافیا کی اس شہر میں عملی طور پر حکومت ہے۔ انسانی سمگلر یہاں دندناتے پھرتے ہیں۔ آپ اسے میری خوش قسمتی کہہ لیں کہ مجھے یہاں ابھی تک کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملا جس کے انڈر ورلڈ کے ساتھ روابط ہوں حالانکہ میں تو سارا دن پیدل ہی شہر کی خاک چھانتا رہا۔ یہاں جو لوگ ملے وہ تو بڑے بھلے مانس اور محبتی سے لگتے ہیں۔

صبح کے وقت ناشتہ کر کے جب چہل قدمی کے لئے نکلا تو مرکزی سڑک پر واقع ایک اوور ہیڈ برج پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ ائیر پورٹ سے ملحقہ علاقے کا ذکر ہے۔ عوام الناس کی کثیر تعداد دیکھ کر میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پل کے اوپر جا پہنچا۔ تمام لوگوں کا رخ ائیر پورٹ کے رن وے کی طرف تھا۔ وہ سب لوگ جہازوں کے اترنے اور چڑھنے کا غالباً منظر دیکھ رہے تھے۔ ناظرین میں بہت بڑی تعداد بچوں اور خواتین کی تھی اور ہر عمر کے مرد بھی موجود تھے۔ والدین بچوں کو جہازوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں مصروف تھے۔ عوام کی اس مستقل بھیڑ سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت سے چھابڑی فروش بھی پل پر براجمان تھے۔ انہی چھابڑی فروشوں میں سے ایک جو کہ مختلف جہازوں کے پلاسٹک سے بنے ہوئے ماڈل فروخت کر رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا

کہ یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟ مجھے تو یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس آدمی نے مجھے جو وضاحت پیش کی وہ بھی کمال تھی، وہ کہنے لگا کہ اس ہجوم میں شامل لوگوں میں سے نوے فیصد وہ ہیں جو اپنی زندگی میں کبھی بھی جہاز پر سوار نہیں ہوئے ہیں، کچھ تو جبلی تجسس سے مغلوب ہو کر پہنچے ہیں، باقی بہت سے والدین ایسے ہیں جن کے بچے جہاز میں بیٹھنے کی یا پھر جہاز دیکھنے کی فرمائش کرتے ہیں، بچوں کا جی بہلانے کے لئے وہ انہیں اس جگہ لے آتے ہیں، انہی بچوں کو پلاسٹک کے ہوائی جہاز بیچ کر ہماری روزی روٹی بھی چل رہی ہے۔

دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان اس سے زیادہ معاشی فرق کی مثال پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی جتنا فرق امریکہ اور میکسیکو کے درمیان ہے۔اس پل سے امریکی سرحد اور سرحدی کھمبے بھی صاف نظر آتے ہیں جن پر لگے زرد قمقموں کی قطار رات کے وقت دور سے دیکھنے پر روشنی کی ندی محسوس ہوتی ہے۔سرحد کے اس پار لاس اینجلس میں تین، چار مرتبہ میرا جانا ہو چکا ہے۔ کیلی فورنیا کا قصبہ سان ڈیا گو تو بالکل ہی پاس ہے۔تی خوانا اور سان ڈیا گو کے درمیان بارڈر کراسنگ بھی موجود ہے جیسے لاہور اور واہگہ کے مقام پر جہاں پیدل سرحد عبور کی جا سکتی ہے۔ ہر سال پانچ کروڑ لوگ امریکہ اور میکسیکو کے درمیان واقع کراسنگ عبور کرتے ہیں۔جس کی بنیاد پر اسے دنیا کی مصروف ترین بارڈر کراسنگ کہا جاتا ہے۔مگر سچی بات یہ ہے کہ اتنی قربت کے باوجود امریکہ اور میکسیکو دو علیحدہ علیحدہ دنیائیں ہیں۔رنگ، نسل، زبان کا فرق کوئی بڑی بات نہیں ہے، زندگی گزارنے کا ڈھنگ دونوں ملکوں میں اتنا مختلف ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ دونوں ملک ایک ہی سیارے پر واقع ہیں۔

آج تو یہ تصور سے بھی ماورا لگتا ہے کہ 1847 تک کیلی فورنیا کی پوری ریاست میکسیکو کا حصہ تھی اور امریکہ نے جب میکسیکو پر جنگ مسلط کرنے کے بعد کیلی فورنیا پر قبضہ کر لیا تو امن معاہدے میں جو شرمناک شرائط رکھی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اب کیلی فورنیا سمیت میکسیکو کا بہت سارا علاقہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ہوگا۔ چونکہ سپین کی نوآبادیاتی حکومت سے آزادی حاصل کیئے میکسیکو کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔اس لئے عسکری اعتبار سے امریکی افواج کی

مزاحمت کرنا ان لوگوں کے لئے ممکن بھی نہ تھا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی مناسب ہوگا کہ برطانیہ کے برعکس سپین اپنی نوآبادیات سے عزت کے ساتھ رخصت نہیں ہوسکا۔ تقریباً ہر نوآبادی سے ہزیمت اٹھانے کے بعد ہی نکلا ہے۔ میکسیکو سے بھی دس سالہ خانہ جنگی کے بعد شکست فاش کا امکان دیکھا تو پھر دم دبا کر بھاگ گیا۔ یہ دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ سرحد کے اس طرف جہاں میکسیکو کا پانچواں بڑا شہر تی خوانا واقع ہے یہ ریاست بھی کیلی فورنیا زیریں کہلاتی ہے۔

خوان کارلوس میکسیکو میں فروٹ اور سبزیاں فراہم کرنے والی چھوٹی سی کمپنی چلاتا ہے۔ اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ امریکہ اور میکسیکو کے درمیان باہمی تعلقات بھی ویسے ہی ہیں جیسے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہیں۔ خوان کارلوس تین سال تک برطانیہ میں رہ چکا ہے۔ جہاں برصغیر سے آئے تارکین وطن کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، اس لئے وہ پاک وہند مخاصمت سے بخوبی واقف ہے۔ میکسیکو کے لوگوں کی امریکہ سے نفرت اس لئے عجیب لگتی ہے کہ روزانہ اس شہر سے کیلی فورنیا جانے اور آنے والوں کی تعداد تین لاکھ ہے۔ ہر تیسرے، چوتھے گھر کا کوئی فرد امریکہ میں موجود ہے۔ شائد اس کی بھی وہی وجوہات ہیں جو ہمارے اور ہندوستان کے موجودہ تعلقات کی ہیں۔

میکسیکو میں ایک اور عجیب وغریب بات دیکھی۔ قدیم مقامی قبائل کے مقبروں کی جگہ کلیسا تعمیر کردیئے گئے ہیں۔ میں نے خوان کارلوس سے کہا کہ ویسے تو تم لوگ ہم مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہو کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے، مگر یہ سب کیا ہے؟ تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو نہ صرف شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظم بلکہ آسٹریلیا میں بھی عیسائیت کے غلبے کی واحد وجہ یورپی ممالک کا وہاں تسلط اور ان کا مسلط کردہ نوآبادیاتی نظام ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں تو مقامی مذاہب شاید دو تین فیصد بھی وجود نہیں رکھتے اور اپنی بقاء کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایسے حقائق کے باوجود مسلمانوں کو الزام دینا کہ ان کا مذہب تلوار کے زور پر پھیلا ہے، زیادتی نہیں ہے؟ میرے سوال کے جواب میں خوان کارلوس مسکرا کر کہنے لگا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر طاقت ور کا نظریہ پھیلتا ہے۔ محکوم

کا نظریہ کہیں بھی نہیں پنپتا، براعظم چاہے دنیا کا کوئی بھی ہو۔

ہم باتوں میں مشغول تھے کہ یکا یک کالی بدلی آئی اور بارش شروع ہو گئی۔ امریکہ اور میکسیکو میں منقسم کیلی فورنیا کی ریاست میں ایک چیز سرحد کے دونوں جانب مشترک ہے، وہ ہے موسم اور بارش کے سبب زمین سے اٹھتی مٹی کی سوندھی خوشبو۔

لیون ٹراٹسکی کا گھر

آج دنیا کے امیر ترین پچاسی افراد کے پاس اس عالمِ رنگ و بو کی آدھی آبادی سے زیادہ سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔سادہ ترین الفاظ میں ساڑھے تین ارب غریب لوگوں کے پاس جتنی مجموعی جمع پونجی ہے، یہ صرف پچاسی امیر ترین افراد ان سے زیادہ دولت کے مالک ہیں۔میرے سامنے اس وقت عالمی ادارے آکسفیم کی رپورٹ پڑی ہے،اس میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ کے صرف پانچ خاندانوں کے پاس جمع دولت کا تخمینہ اس دنیا کی بیس فیصد غریب آبادی کے کل اثاثہ جات سے زیادہ ہے۔

لیون ٹراٹسکی کی قبر کے کتبے پر بنی درانتی اور ہتھوڑے کی کمیونسٹ علامت کو دیکھ کر میں سوچتا رہا کہ اگر سوویت یونین میں لینن کی موت کے بعد اسٹالن کی بجائے وہ صدر بن جاتا تو آج دنیا کا نقشہ کتنا مختلف ہوتا؟ سوویت یونین کے نام سے قائم ہونے والی پہلی اشتراکی ریاست،جس کا سرخ پرچم ٹراٹسکی کی قبر پر لہرا رہا ہے شاید آج بھی موجود ہوتی۔یوکرائن کے یہودی اکثریتی شہر اوڈیسہ میں پیدا ہونے والا یہ شخص جو میکسیکو شہر میں اپنے صحن میں مدفون ہے،روس کی سرخ سپاہ کا معمار تھا۔بالشویک انقلاب کے بانی لینن کا دستِ راست،وزیرِ دفاع و امورِ خارجہ،اس کی موت کے بعد منصبِ صدارت کا سب سے مضبوط امیدوار تھا۔قرعہ فال مگر اسٹالن کے نام نکلا،جس کی وجہ غالباً ٹراٹسکی کا یہودی خاندانی پس منظر بھی ہو سکتا ہے۔اکتوبر ۱۹۱۷ کے سوویت انقلاب کی تفصیل پڑھنے کے لئے ٹراٹسکی کی تحریر کردہ آپ بیتی ''میری زندگی'' سے بہتر شاید ہی کوئی کتاب ہو گی۔خاص طور پر انقلاب کی رات کا بیان تو ایک تاریخی شاہکار ہے۔ہمارے ترقی پسند مرحوم دوست جاوید شاہین نے اس کتاب کا بڑا خوبصورت اردو ترجمہ کیا ہے۔

عہد ساز ادیب میکسم گورکی اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ لینن سے ذکر کیا کہ لوگ لیون ٹراٹسکی اور اس کے اختلافات کی افواہوں کا ذکر کرتے ہیں، لینن نے برملا ان افواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ''انسانی تاریخ میں لیون ٹراٹسکی جیسی ایک مثال دکھاؤ، جس نے ایک سال میں ایک ماڈل فوج تیار کی ہو'' اسٹالن نے اقتدار سنبھالنے کے بعد آمرانہ طرزِ حکومت اپنایا تو لیون ٹراٹسکی نے اس پر تنقید شروع کر دی۔ جوں جوں جوزف اسٹالن کے آمرانہ ہتھکنڈے بڑھتے گئے، ٹراٹسکی کی تنقید میں بھی شدت آتی گئی، اس کا کہنا تھا کہ سوشلزم کو اسٹالن ازم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ وہ زیادہ جمہوری مزاج کا آدمی تھا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بارے میں اس کی پیشین گوئیاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی ہیں۔ بالآخر اسے جلا وطنی اختیار کرنا پڑی۔ ایک ٹراٹسکی کا ہی ذکر نہیں، لینن کی موت کے وقت پولٹ بیورو کے کل ستائیس ممبر تھے، اسٹالن کے تین سالہ اقتدار کے بعد ان میں سے دو باقی بچے تھے، بقیہ قتل کر دیئے گئے، جلاوطن ہو گئے، یا پھر سائبیریا کی جیلوں میں بھجوا دیئے گئے۔ یوں اشتراکی نظام عملی طور پر آمریت میں تبدیل کر دیا گیا۔

جلاوطنی کے ایام ٹراٹسکی نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ میکسیکو کے جس مکان میں گزارے اسے ''سرخ نشیمن'' کہتے ہیں۔ قلعہ نما گھر کا رقبہ کوئی پانچ کنال ہوگا، جس کے کونوں پر مورچے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں اس نے بہت ساری مرغیاں پال رکھی تھیں۔ جن کو وہ خود دانہ ڈالتا تھا۔ انڈے اکٹھے کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک سچے مارکسسٹ کو لازمی طور پر جسمانی کام کرنے کا عادی ہونا چاہیئے، گھر کے وسط میں باغیچہ ہے جو اس نے خود سینچا تھا، خود ہی گوڈی کرتا اور پودوں کی تراش خراش میں وقت گزارتا۔ اسی باغیچے میں ایک حوض کے ساتھ اس کی سمادھی ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق اسے دفن نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی وصیت کے مطابق جلا کر راکھ کو اس گھر کے آنگن میں دفنایا گیا ہے۔ اس باغیچے کے ایک طرف دو منزلہ لائبریری اور ڈرائنگ روم ہے جبکہ دوسری طرف رہائش کا حصہ ہے۔ اس انقلابی دانشور کے دن کا زیادہ حصہ اسی لائبریری میں پڑھنے لکھنے میں گزرتا۔ دیواروں پر اب جا بجا ٹراٹسکی کی تصاویر آویزاں ہیں جو اس کی زندگی کے شب و روز کی آئینہ دار بھی ہیں۔ لائبریری سے

باغیچے کی طرف جاتے ہوئے اس مشہورِ عالم تصویر پر نظر پڑتی ہے جس میں سوویت پولٹ بیورو کی سٹالن کی سربراہی میں ایک میٹنگ کی منظر کشی کی گئی ہے، ٹراٹسکی کی تصویر کی جگہ کرسی پر اس کی صرف ٹوپی دکھائی گئی ہے۔ کیونکہ اسٹالن کے دور میں ٹراٹسکی کی تصویر بنانے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔

بیڈروم کی تمام کھڑکیاں اور دروازے لوہے کی چار انچ موٹی چادر سے بنے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ بیت الخلاء کا دوازہ بھی آہنی اور چار انچ موٹا ہے۔ جیل کے دروازے بھی اتنے موٹے نہیں ہوتے جتنے یہاں تھے۔ سادہ سا سنگل بیڈ، عام چارپائی کے سائز سے بھی چھوٹا ہی لگتا ہے۔ ایک چھڑی اور ٹیبل پر چند کتابیں دھری ہوئی ہیں۔ اس کمرے کے ساتھ ہی بچوں کے سونے کا کمرہ ہے۔ دوسری طرف ڈائننگ روم اور اس سے ملحقہ کشادہ باورچی خانہ۔ کھانے کے کمرے میں میز پر کھانے کی پلیٹیں ویسے ہی چنی ہوئی ہیں جیسے ٹراٹسکی کی زندگی میں۔ یہ گھر آباد گھروں جیسا لگتا ہے، میوزیم بالکل بھی نہیں لگتا۔ چند برس پہلے ٹراٹسکی کے گھر سے ایک سرنگ دریافت ہوئی ہے جو مشہورِ زمانہ مصورہ فریدا کاہلوں کے گھر جاتی ہے، فریدا کا گھر چند سو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ جسے ''نیلا آستانہ'' کہا جاتا ہے۔ وہ ٹراٹسکی کی محبوبہ بھی تھی اور ابتدائی دنوں میں میزبان بھی تھی۔ کٹر کیمونسٹ ہونا دونوں کی قدرِ مشترک تھی۔

جلاوطنی کے ایام میں بھی ٹراٹسکی نے انقلابی خیالات کا پرچار جاری رکھا۔ انقلابِ روس میں اس کے کردار اور عوامی مقبولیت کے باعث اسٹالن اسے اپنی حکومت کے لئے خطرہ سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس کے خون کا پیاسا تھا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ ٹراٹسکی جلاوطنی میں ہی قتل کردیا گیا۔ اس کے قتل کے بعد اس کے تمام بچوں کو بھی اسٹالن نے قتل کروادیا۔ ٹراٹسکی کا ایک پوتا اب بھی میکسیکو شہر میں رہتا ہے۔ جس کی اجازت سے اس کا گھر عوامی مقام میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ یہ گھر اب ٹراٹسکی کا مدفن بھی ہے۔

سوشلزم اور کیمونزم تو اب ماضی کے نعرے ہیں۔ کارل مارکس کوئی پیغمبر نہیں تھا، ایک ذہین یہودی معیشت دان تھا، جس نے دو صدیاں پہلے یورپ کے معاشی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک متبادل معاشی نظام تجویز کیا تھا، جس سے انسانی دکھوں میں کمی آنے کا امکان تھا۔ آج ہم مختلف

دنیامیں سانس لے رہے ہیں، حالات آج کل کے بالکل مختلف ہیں۔مگرصرف پچاسی افراد کے پاس ساڑھے تین ارب انسانوں کی مجموعی مال ومتاع سے زیادہ سرمایہ اکٹھا ہونا بھی غیرانسانی ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جہاں بھی کثرت سے سرمایہ جمع کیا گیا وہاں کسی ایک، یازیادہ افراد کی حق تلفی ضرور ہوئی ہے۔آج جہاں دنیامیں ایک طرف غربت بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف یہ بحث ہورہی ہے کہ ڈالروں میں ارب پتیوں کے بعداب پہلا کھرب پتی کون ہوگا؟ بل گیٹس، وارن بفیٹ یا پھرکوئی اور ہوگا۔میرے ذہن میں مگرسوویت انقلاب کا قائداورسرخیل لیون ٹراٹسکی ،اس کا گھراورمدفن جانے کیوں گردش کرنے لگے ہیں،جس نے کہا تھا کہ دولت کی مساویانہ تقسیم ہونی چاہئے۔باقی تمام راستے تباہی کی طرف جاتے ہیں۔

فریدا کا نیلا آستانہ

گزشتہ ہفتے نیویارک کے ایک بوٹینیکل گارڈن میں اپنی طرز کی ایک منفرد نمائش کا افتتاح ہوا ہے۔اس نمائش میں میکسیکو سے تعلق رکھنے والی مشہور عالم مصورہ اور شاعرہ فریدا کاہلو کے گھر، باغیچے اور سٹوڈیو کے ماڈل اوراس فنکارہ کے چند تخلیقی شہ پارے پیش کیے گئے ہیں۔''فن، باغ اور زندگی'' کے عنوان سے ہونے والی اس نمائش میں بوٹینیکل گارڈن کواس طرح ترتیب دیا گیا ہے، جیسے مصورہ کی زندگی میں اس کا گھر، باغیچہ اور سٹوڈیو قائم تھا۔''دی کاہلوشو'' کے نام سے یہ نمائش تو یکم نومبر تک جاری رہے گی، مگر میں ذرا زیادہ خوش قسمت نکلا کہ مجھے میکسیکو شہر میں واقع فریدا کے اس اصل گھر کو دیکھنے کا موقع میسر آ گیا جسے''نیلا آستانہ'' کہتے ہیں۔گھر کے باہر اور اندر گہرے نیلے رنگ کے در و دیوار کی نسبت سے نام پانے والی اسی رہائش گاہ میں فریدا پیدا ہوئی، اور 47 سال کی مختصر مگر بھرپور و بامعنی زندگی گزار کر یہیں فوت ہوئی۔فنکار کی عظمت کو پیسے کے ترازو میں تولنا سراسر زیادتی ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ منڈی کی معیشت میں چیزوں کی اہمیت کا اندازہ فقط ان کی قیمت فروخت سے ہی لگایا جاتا ہے۔چیز بے شک فنون لطیفہ پر مبنی اور اس کا خالق بھلے بائیں بازو کے نظریات پر ہی یقین کیوں نہ رکھتا ہو۔ گزشتہ برس فریدہ کاہلو کی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ 6.5 ملین ڈالر، یعنی 65 کروڑ روپے میں فروخت ہوئی ہے، جو کہ لاطینی امریکہ کے کسی بھی مصور کی اب تک فروخت ہونے والی سب سے مہنگی تخلیق ہے ۔میکسیکو کی مقامی کرنسی کو''پیسو'' کہتے ہیں، جو کہ ایک ڈالر میں پندرہ آ جاتے ہیں، پانچ سو پیسو کا کرنسی نوٹ دیکھیں تو اس کے ایک جانب فریدا کاہلو کی تصویر بنی ہوئی ہے اور دوسری طرف اس کے مصور شوہر ڈیگو راویرا کی تصویر پائی جاتی ہے۔ان دو مثالوں سے فنکارہ کی اہمیت کسی حد تک

اجاگر ہو جاتی ہے۔

کسی بھی ملک کے عوام عمومی طور پر کس طرح کے رویوں کا اظہار کرتے ہیں، یہ معلوم کرنے کا ایک آسان اور تیر بہدف طریقہ پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا ہے۔ میکسیکو شہر جو کہ ملک کا دارالحکومت ہے، اس کی میٹرو بس اور زیر زمین ریلوے مقبول ذرائع آمدورفت ہیں۔ ایئر پورٹ سے اترتے ہی میں میٹرو بس میں سوار ہو گیا جو لاہور، لندن یا دیگر ممالک کی میٹرو بس جیسی ہی ہے، البتہ اس کے بعد ریل کا سفر بہت دلچسپ رہا۔ حاصل سفر تو نابینا گلوکار کی لائیو پرفارمنس کو کہوں گا، میوزک کی مقبول دھنیں اس کے سینے پر باندھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر پر بج رہی تھیں اور ان دھنوں پر نابینا گلوکار گا رہا تھا۔ ایسی سریلی آواز زندگی میں کم کم ہی سننے کا اتفاق ہوا، ایسا خوبصورت الاپ کہ الفاظ میں بیان کرنے سے عاجز ہوں، اس طرز گائیکی کو مغرب میں ''کاراؤکے'' کہتے ہیں۔ پیٹ کے ساتھ ایک دھاتی ڈبہ اس نے باندھ رکھا تھا جس میں لوگ انعام کے طور پر سکے گرا رہے تھے۔

آوازیں لگا کر سودا بیچنے والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو یہ احساس ہی مٹ گیا کہ میں پاکستان سے بہت دور ہوں۔ آوازوں میں وہی روایتی طنطنہ، لجاجت اور خوداعتمادی مگر یہاں بکنے والے سودے ہم سے ذرا مختلف نوعیت کے ہیں۔ مثلاً لکھنے کے لیے رنگ برنگے مارکر، پھر ایک نوعمر لڑکی نے موبائل فون اور دیگر آلات پر میوزک سننے کے لیے پانچ پیسو کے ہیڈ فون کی آواز لگائی۔ تھوڑی دیر میں بیٹری ٹارچ بیچنے والا لڑکا نمودار ہو گیا۔ اسی اثنا میں ''کویا کان کا سٹاپ آ گیا، جس علاقے میں فریدا کا هلو کا گھر ہے۔ اسٹیشن سے دس منٹ کے مسافت میں نے پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ لندن کی گلی میں کونے کے نیلے مکان کے سامنے بورڈ آویزاں تھا، فریدا کاهلو میوزیم۔ لاطینی امریکہ میں ایک قدر مشترک ہے کہ گلیوں، سڑکوں اور چوراہوں کے نام عمومی طور پر دیگر ممالک اور ان کے شہروں کے نام پر رکھے جاتے ہیں، آپ حیران ہوں گے کہ چلی کے دارالحکومت سنتیاگو میں ایک اہم چوراہا ''پاکستان چوک'' کا بھی ہے۔ حالانکہ ہماری حکومت نے تو اس ملک میں اپنا سفارت خانہ ہی بند کر دیا ہے۔

گہرے نیلے رنگ کے مکان میں داخل ہوا تو نیلی دیواروں، سرخ فرش اور سبز باغ نے

ذہن میں وہی فضا بنا دی جو کہ فریدا کے ہاتھ سے بنی تصاویر کا خاصہ ہے۔ دنیا میں کسی بھی مصور نے گہرے رنگوں کا اپنی تخلیقات میں ایسی دلیری سے استعمال نہیں کیا جتنی بے تکلفی سے اس فنکارہ نے انہیں برتا ہے۔دالان میں کپڑے اور کاغذ کی رنگ برنگی پتلیاں اور فریدا کے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا فانوس لٹک رہا ہے۔ہم فریدا کے فن سے تو متاثر تھے ہی لیکن میکسیکوسٹی کے اس گھر کا باغیچہ بھی اس فنکارہ کے فن کا بھرپور اظہار کرتا ہے،فریدا1907ء میں جب اس گھر میں پیدا ہوئی تو اس کے والدین نے اسے مگدالینا کارمین کا نام دیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں وہ پولیو کا شکار ہوگئی جس سے اس کی ایک ٹانگ سکڑ گئی ،اٹھارہ

سال کی عمر میں ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہوئی جس میں اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ دو سال کے لیے بستر سے لگ کر رہ گئی۔اسی دوران اس نے فن مصوری کی طرف توجہ دی۔اسی بیماری کے دوران اس کی ملاقات اپنے مصور شوہر ڈیگوراویرا سے ہوئی جو کہ محبت میں بدل گئی۔ڈیگوراویرا نے اس کی بنائی ہوئی ابتدائی تصاویر دیکھ کر کہا کہ وہ قدرتی مصورہ ہے۔

فریدا کا ہلوکو عظیم مصورہ اور کٹر کیمونسٹ بنانے میں ڈیگوراویرا کا کلیدی کردار ہے۔جسمانی معذوری اور علالت سے جس عظیم حوصلے کے ساتھ یہ خاتون لڑی ہے،انسانی تاریخ میں اس کی مثال کم کم ہی ملتی ہے،اس کا تمام فنی سفر شدید جسمانی تکلیف ، وہیل چیئر اور تنہائی میں گزرا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی بنی ڈیڑھ سو کے قریب کل تصاویر میں سے پچپن اس کے اپنے پورٹریٹ ہیں۔اس بابت فریدا دو وضاحتیں پیش کرتی ہے۔ایک یہ کہ وہ بہت زیادہ وقت تنہائی میں گزارتی ہے اور دوسری وجہ اس کی ذات ہی وہ عنوان ہے جسے وہ سب سے بہتر جانتی ہے۔

روس میں بالشویک انقلاب کے بانی رہنما،اور سویت یونین کی فوج کے پہلے سربراہ لیون ٹراٹسکی جب اسٹالن حکومت کی مخالفت کے سبب جلاوطن ہوئے تو وہ اسی نیلے آستانے میں دو سال رہائش پذیر رہے۔وہ ٹراٹسکی جس کو لینن کے بعد سویت یونین کی صدارت کا سب سے مضبوط امیدوار قرار دیا گیا تھا، بالآخر پولٹ بیورو کی رکنیت اور سویت یونین کی مرکزی وزارت سے بھی محروم کر دیا گیا تھا

،اسکی حفاظت کے لیےاس مکان کی بیرونی کھڑ کیوں کو اینٹوں سے چن دیا گیا تھا،حفاظتی نقطہ نظر سے دیواروں کی اونچائی میں بھی خصوصی طور پر اضافہ کیا گیا تھا۔لیون ٹراٹسکی کا فریدا کے ساتھ معاشقہ بھی اہم بات ہے،کم وبیش دوسال اس گھر میں گزارنے کے بعد ٹراٹسکی کچھ ہی فاصلے پر اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہوگیا،اسی مکان میں اسے مبینہ طور پر اسٹالن کے کارندوں نے قتل کردیا تھا۔نیلے آستانے اور ٹراٹسکی کے مکان، جسے اب میوزیم میں تبدیل کردیا گیا ہے ایک زیرزمین خفیہ سرنگ تھی، جسے پچھلے دنو ں ہی عوام کے لیے کھولا گیا ہے۔کوچہ ویانہ میں واقع لیون ٹراٹسکی کا ''سرخ نشمین'' جہاں اس کی سمادھی بھی ہے،ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔فریدا کے بیڈروم میں ایک منظر دیکھ کر میں حیران ہوا،وہاں کارل، مارکس،لینن،فریڈرک اینگلزاور ماؤزے تنگ کے علاوہ جوزف اسٹالن کی بھی تصویر موجود تھی، ظاہر ہے فریدا کے اپنے ہاتھ سے تخلیق کردہ،حیرت ہے کہ ۱۹۵۴ء میں اپنی وفات سے پہلے جو نامکمل تصویر وہ تخلیق کررہی تھی وہ بھی اسٹالن کی ہی تھی،تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ زندگی کے آخری ایام میں لیون ٹراٹسکی کیساتھ فریدا اور اسکے شوہر کی بول چال بند ہوگئی تھی۔ڈیگوراویرا اور فریدہ کے درمیان ۱۹۳۹ء میں طلاق ہوگئی تھی،مگراگلے برس دونوں کی دوبارہ شادی ہوگئی،طلاق کی وجہ ڈیگوراویرا اور فریدا کے غیر ازدواجی تعلقات بیان کیے جاتے ہیں۔فریدا کا اپنا بیان ہے کہ ''میں پیدائشی مصورہ اورکتیا ہوں'' فریدا کی موت کے بعداس کے شوہر نے ''نیلا آستانہ'' اس شرط پر حکومت کو عطیہ کردیا کہ اس میں کسی قسم کی کو ئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔اسی لیے گھر میں سیر کرتے ہوئے یہی محسوس ہوتا ہے کہ فریدا بھی کہیں آس پاس ہی ہوگی۔اس عظیم فنکارہ کی زندگی پر ہالی ووڈ نے ایک فلم بھی تخلیق کی ہے،''فریدا'' نامی اس فلم کو آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔آٹھ سوگز کے دومنزلہ گھر سے نکلا تو ایک یورپی جوڑا آپس میں کسی بات پر جھگڑرہا تھا،خاوند نے اپنی ادھیڑ عمر بیوی کو طعنہ دیا کہ تم پر فریدا کے نیلے آستانے کا سایہ پڑ گیا ہے،اسی لیے بدتمیزی پر اتر آئی ہو۔

لیما کی ایک نمائش

لیماایک شہرہی نہیں ایک منفردطرز زندگی کا نام ہے۔گرچہ سبزہ اس شہرمیں نایاب ہے مگرفضاانتہائی خوشگوار ہے، جوایک مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کردیتی ہے۔موسموں میں یہاں شدت نظرنہیں آتی، گرمی، سردی، دونوں ہی یہاں مہربان ہیں۔شہر کے اردگرد پہاڑ ہیں جن پر سبزہ کم کم اور خشکی زیادہ ہے۔صحرا کا گمان گزرتا ہے کہیں کہیں یہاں۔لوگ ہنس مکھ اور دوستانہ مزاج رکھتے ہیں۔ادب، آداب کا گفتگو میں بہت زیادہ خیال کرتے ہیں۔مجھے عموماً میٹروپولیٹن شہرزیادہ پسندنہیں آتے،اس کی وجہ ایک تو مادہ پرستی کا رواج، بھیڑ بھاڑ اور لالچ کا چلن ہےتو دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان بڑے شہروں کے باسی اس مضافاتی گرم جوشی سے محروم نظرآتے ہیں جو کہ بڑے شہروں سے دوردراز رہنے والے لوگوں کا خاصہ ہے۔لیمانے مجھے اپنے نظریات سے رجوع اورنظرثانی پرمجبور کردیا کیونکہ اس شہر کی آبادی ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہے، جوکہ نہ صرف اسے پیرو کا سب سے بڑا شہر بناتی ہے بلکہ لاطینی امریکہ کے بڑے شہروں کی فہرست میں نمایاں مقام دلاتی ہے۔ملک کی آبادی کا ایک تہائی اس شہرمیں آباد ہے، یعنی ہرتین میں سے ایک ''پیروانو'' لیما میں رہتا ہے۔اس کے باوجود شہر میں کوئی رش نظرنہیں آتا ہے، وہ بے ہنگم بھیڑ اور ہاہا کار مچی بھی کہیں نظرنہیں آتی جو ہمارے بڑے شہروں کا خاصا ہے۔

شہر کے ساتھ سمندر اور اس کے ساحل کا بڑا چرچا سنا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث بحرالکاہل کا یہ کنارہ دیکھنے سے محروم رہا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ محدود وقت میں یا تو شہر کی ہسپانوی طرزتعمیر کا شاہکار مرکزی لائبریری میں جاری نمائش دیکھ سکتا تھا، یا پھر ساگر کی لہریں۔گرچہ فروری کا مہینہ ہواؤں کے راج کا عروج مانا جاتا ہے اور ساحل کی سیر کے لئے آئیڈیل سمجھا جاتا ہے۔یہ بھی بتا تا چلوں کہ سردی کی انتہا کا مہینہ

یہاں اگست ہے یعنی نہ صرف اس ملک کا وقت ہم سے الٹا ہے، یعنی دن رات کی تفاوت ہے، بلکہ موسم بھی ہم سے متضاد ہیں۔ نمائش کے انتخاب کی وجہ این فرینک کی شخصیت تھی اور اس کی ڈائری کی عالمی شہرت۔ میں اسے اتفاق ہی کہوں گا کہ میری منزل لیما سے سینکڑوں کلومیٹر دور بولیویا اور چلی کے سرحد سے ملحقہ چھوٹا سا شہر تکنا تھا، اس شہر کے لئے مگر کوئی پرواز شام سے پہلے دستیاب ہی نہیں تھی۔ ابھی تو دن کا آغاز ہوا تھا جب میری پرواز صبح سویرے اس شہر کے ائیر پورٹ پر پہنچی۔ یہاں یہ اعتراف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ میں بنیادی طور پر یہاں سیاحت کے مقصد کے تحت نہیں پہنچا تھا، بلکہ جس دور افتادہ شہر کا تذکرہ کیا ہے، وہاں جاپانی ری کنڈیشن گاڑیاں بیچنا میرا مقصود تھا۔ میرے بڑے بھائی وہاں مقیم تھے اور ہمارا اس ٹیکس فری زون میں گاڑیوں کا شوروم تھا۔ ہمارے علاوہ سو سے زائد پاکستانی بھی اس شہر میں آباد تھے جو اسی پیشے سے منسلک تھے۔ ذکر این فرینک کی اس مشہور زمانہ ڈائری کا جس کو اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کے زیرِ تسلط ہالینڈ میں اپنی نوعمری کے دوران روپوشی کے دنوں میں تحریر کیا تھا۔

ایک نوعمر یہودی لڑکی جس نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران نازی فوج سے جان بچانے کے لئے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ چھپتے ہوئے ،روپوشی کے ماہ وسال کے دوران یہ یادداشتیں تحریر کیں، این فرینک ہٹلر کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوئی اور پھر بیگار کیمپ میں سولہ سال کی عمر میں زندگی کی بازی ہار گئی، مگر اس کی ڈائری نے اسے جنگ کے دوران یہودیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی علامت بنا دیا۔

یہ این فرینک کی ڈائری اور اس کے حالات زندگی کو اجاگر کرنے کے لئے گشتی نمائش تھی جو اب پیرو کے دارالحکومت پہنچی تھی۔ تیرہ، چودہ سال کی معصوم سی بچی بنیادی طور پر جو صرف زندہ رہنے کی خواہش رکھتی ہے۔ کیسے بھوکی، پیاسی اپنے گھر میں چھپ کر ماہ وسال گزارتی ہے۔ سوات کی ملالہ یوسفزئی کے لئے اہلِ یورپ کی ہمدردی اور محبت کی وجہ میری نظر میں تو این فرینک ہے۔ دونوں کے حالاتِ زندگی بہت زیادہ ملتے ہیں۔ دونوں کی وجہ شہرت ان کی ڈائری کے علاوہ یہ بھی

ہے کہ دونوں ہم عمر ہیں۔فرینک اور ملالہ اپنے ہی دیس میں اجنبی ٹھہرتی ہیں کیونکہ شہر پر ظالموں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

ایمسٹرڈیم جانا ہوا تو میں خصوصی طور پر این فرینک کے گھر کو دیکھنے کے لئے بھی گیا، جو کہ اب میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔چار منزلہ عمارت میں ہر چیز ویسی کی ویسی ہی ہے جیسے این فرینک چھوڑ کر گئی تھی۔اس میوزیم اور وہاں تصاویر کو دیکھنے کے بعد انسانیت سے محبت رکھنے والے ہر اہلِ دل کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔وہ تو سمجھی تھی کہ اس کا باپ نازی فوج کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے مگر وہ معجزانہ طور پر بچ نکلا، یہ مکان اس نے 1940 میں خریدا تھا اور بیوی بچوں کی موت کے بعد اس نے اس مکان کو میوزیم میں تبدیل کر دیا۔

این فرینک کی ڈائری بھی اس کے والد نے اس کی موت کے کئی سال بعد شائع کروائی۔ ہالینڈ کے دارالحکومت میں پیتل سے بنائے گئے این فرینک کے مجسمے کے پاس کھڑا میں سوچتا رہا کہ اس معصوم لڑکی کو مارنے کی کیا وضاحت ہو سکتی ہے؟اب سوچتا ہوں ہٹلر کے فوجی بھی اس سے ملتی جلتی کوئی توجیح پیش کر دیتے جیسے ملالہ کو نشانہ بنانے والے طالبان دلائل پیش کرتے ہیں۔

نیلسن منڈیلا کہتے تھے کہ جیل میں اسیری کے دوران این فرینک کی ڈائری نے انہیں ہر بار نیا حوصلہ بخشا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسرائیل کی ریاست اور یہودیت ایک چیز نہیں ہیں۔اسرائیل فلسطین کی زمین پر غاصبانہ قبضے کے نتیجے میں گزشتہ صدی کے دوران معرضِ وجود میں آیا جبکہ یہودیت پانچ ہزار سال پرانا مذہب ہے۔ویسے بھی یہودیوں کا سب سے بڑا مسکن اسرئیل نہیں بلکہ امریکہ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اہلِ یورپ نے یہودیوں پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں اور اپنے اجتماعی ضمیر کا بوجھ اتارنے کے لئے اسرائیلی ریاست تشکیل دی تھی۔ یہودیوں کے لئے الگ وطن کا تصور قابلِ فہم ہے اور ان پر ہونے والے مظالم سے بھی کوئی صاحب مطالعہ انکار نہیں کر سکتا، مگر اس ظلم کی سزا غریب فلسطینیوں کو نہیں ملنی چاہیئے۔ فلسطینی اپنے گھروں میں ویسے ہی بے وطن ہو گئے جیسے این فرینک ہوئی تھی۔

یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر کے یہودیوں پرڈھائے گئے مظالم کا ایک منفرد پہلو دکھانے والی این فرینک کی یہ کتاب دنیا میں امریکہ میں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہے،اس کے بعد جاپان میں یہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔مزید یہ کہ ایمسٹرڈیم میں اس کے گھر ہر سال تیس ہزار جاپانی سیاح حاضری دینے جاتے ہیں۔نمائش سے باہر نکل رہا تھا تو ایک مقامی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔اس نے بڑا دلچسپ سوال پوچھا کہ سنا ہے یہودیوں کی طرح تم مسلمان لوگ بھی زمین خریدنا بہت پسند کرتے ہو؟اب اپنے ملک پاکستان کی بات کروں تو واقعی یہ تاثر درست ہے لیکن باقی دنیا کے مسلمانوں کے متعلق میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔البتہ یہودیوں کی زمین سے رغبت اور اس کی خریداری کا سبب شاید صدیوں پر محیط بے گھری اور دربدری ہے۔لاطینی امریکہ میں زمین پاکستان کی نسبت کافی سستے داموں خریدی جاسکتی ہے۔

پیرو کا تکنا

تین کروڑ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے دنیا کا انیسواں بڑا ملک پیرو براعظم شمالی و جنوبی امریکہ کا قدیم ترین تہذیبی مرکز ہے۔ یہ دیس انسانی تاریخ کے قدیم ترین تمدن ''ان کا'' دارالحکومت تھا اور ''ان کا'' سلطنت جو تقریباً پورے جنوبی امریکہ پر حکومت کرتی تھی، اس کا سربراہ اسی ملک کے شہر ''ما چو پیچو'' میں اپنا دربار لگاتا تھا۔ میسو پوٹیمیا، بابل و نینوا کو بھی دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر وہاں مرکزی حکومت ایسی مضبوط نہیں تھی جیسی ''ان کا'' تہذیب میں تھی۔ اس کے علاوہ جس قدر پھیلی ہوئی یہ سلطنت تھی، ویسی میسو پوٹیمیا، بابل و نینوا میں یقیناً نہ تھی۔ جدید پیرو کی تاریخ دو صدیاں پہلے ہسپانوی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ تین صدیوں پر محیط اس سرزمین کے نو آبادیاتی عہد کی یادگار ملک کی قومی زبان ہسپانوی ہے۔ ''آمارا'' اور ''کیچوا'' بھی قبائلی علاقے میں رائج مقبول زبانیں ہیں۔ مگر سرکاری زبان سپینش ہے۔ اگر تہذیبی ارتقاء کی بات کی جائے تو میری نظر میں وادی سندھ کی تہذیب، جس کے مراکز ہڑپہ اور موہنجوداڑو تھے۔ اپنے وقت میں دنیا کی تمام تہذیبوں سے جدید تر تھی۔

''ان کا'' تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب ضرور قرار دیا جاتا ہے چونکہ ''انڈس تہذیب'' چار سے پانچ ہزار سال پرانی ہے جبکہ ''ان کا'' سات ہزار سال پرانی ہے اور میسو پوٹیمیا بھی، مگر ماچو پیچو کے آثار دیکھیں تو یہاں پتھر کے زمانے کا گمان ہوتا ہے، سب کچھ پتھروں کو تراش خراش کے بنایا گیا ہے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں تو سب کچھ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے، حیرت انگیز طور پر ان اینٹوں کا سائز وہی ہے جو آج بھی دنیا میں معیاری و مستعمل سائز تسلیم کیا جاتا ہے۔ آثار میں ملنے والے

ظروف مٹی سے بنائے گئے ہیں ۔کھیتی باڑی کے جو آلات ملے ہیں وہ جدید دور کے لگتے ہیں ۔چند سال پہلے میں نے نامور ادیب ، دانشور اور صحافی منوّ بھائی کے ساتھ ہڑپہ کے تاریخی آثار کا دورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ موہنجو داڑو اور ہڑپہ کی تہذیب جسے ''انڈس سویلائزیشن'' اور سندھ ساگر کی تہذیب کہا جاتا ہے، ایک سوشلسٹ سماج تھا، یہاں کھانا مفت ملتا تھا، کھدائی میں کہیں بھی جنگ کے آلات نہیں ملے ہیں، حالانکہ کھیتی باڑی کے بہت سے آلات ملے ہیں ۔خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سماج شاید کسی وبائی مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ یا پھر کسی دوسری قدرتی آفت کا شکار ہو گیا ہوگا۔آج صوفیا کرام کی درگاہوں پر لنگر کا اہتمام اور سکھ مذہب میں لنگر کا ماخذ اسی تہذیب سے ہے۔

پیرو کا تذکرہ کریں تو ایمازون کے جنگل اور دریا کا ذکر در آتا ہے، یا پھر آندیس کے پہاڑوں ،ماچوپیچو کی چوٹیوں ،ان کا سلطنت اور ہسپانوی نوآبادیاتی عہد اور اس کے اثرات کا ذکر،مگر میں یہاں ایک چھوٹے سے شہر کی بات کرنا چاہتا ہوں۔جس کی پاکستانیوں کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے، جنوبی امریکہ کے ملک چلی کی سرحد پر واقع اس شہر کا نام تکنا ہے۔

جی ہاں !تکنا شہر کا نام بھی ہوسکتا ہے، اگر آپ تکنا کا مطلب شوق سے دیکھنا سمجھے ہیں تو پھر آپ کا اندازہ غلط ہے۔اس وقت میری مراد پیرو کے جنوب میں واقع اس ملک کے دسویں بڑے شہر سے ہے۔ یہ واقعی قابل دید ہے ۔لہٰذا اگر آپ کا اندازہ نگاہِ شوق تھا تو پھر بھی کچھ زیادہ غلط نہیں تھا، کیونکہ تکنا کو ان معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ چلی کے آخری شہر سے فقط بیس میل کی دوری پر واقع تکنا اور اریکا شہر کی مثال راولپنڈی اور اسلام آباد جیسی ہے۔

آج کل یہاں آباد پاکستانیوں کی تعداد محض دس، پندرہ افراد تک محدود ہوگئی ہے۔مگر کسی زمانے میں یہ دو، تین سو کے قریب ہوتے تھے۔ان سب کا تعلق جاپانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے تھا۔اس کے علاوہ بھی چند کاروباروں میں یہ لوگ شریک رہے ہیں ۔مگر زیادہ افراد اب بھی گاڑیوں کے کاروبار سے متعلق ہیں۔ پرانی گاڑیوں کی درآمد پر پابندی کی وجہ سے زیادہ تر پاکستانی اس ننھے سے شہر سے ہجرت کر گئے ہیں ۔شہر میں ایک عالیشان آباد مسجد ہے جو پاکستانیوں نے تعمیر کی

ہے۔نماز پنجگانہ کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی یہاں باجماعت ادا کی جاتی ہے۔اس پرشکوہ مسجد کو دیکھنے کے لئے سیاح دوردور سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

پورے ملک میں یہ شہر اپنے جذبہ حب الوطنی کے سبب مشہور ہے، 1820 سے شروع ہونے والی جنگ آزادی جس کے سبب 1824 میں ملک کو آزادی ملی۔اور پھر چلی کے ساتھ 1888 میں جنگ بحرالکاہل میں اس شہر نے بہت اہم کردار ادا کیا۔آپ کو بتا تا چلوں کہ پیرو کی آزادی کی تحریک کا آغاز اسی شہر سے 1811 میں ہوا تھا۔جس کے نتیجے میں ملک وجود میں آیا۔اسی شہر کو پیرو اور بولیویا کی مشترکہ ریاست کے دارلخلافہ رہنے کا بھی اعزاز حاصل رہا ہے۔گوکہ یہ یہ اشترا کی ریاست فقط چار سال ہی قائم رہ سکی تھی۔

اس شہر کی تاریخ میں ایک دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب جنگ بحرالکاہل میں چلی نے یہ شہر فتح کرلیا اور اگلے پچاس سال تک یہاں پر اسکی حکومت رہی۔1930 میں ایک معاہدے کے تحت یہ شہر پیرو کو واپس مل گیا۔مگر اگلے دو شہر جو چلی کے ابھی قبضے میں تھے،ان پر اپنا حقِ حاکمیت منوالیا۔حالانکہ وہ پیرو کا صدیوں سے حصہ چلے آرہے تھے۔گزشتہ صدی کی ابتدا میں یہ شہر اٹلی سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی مقبول ومعروف منزل رہا۔جنگ اور اس کے بعد کے حالات نے اس میں کافی تبدیلی پیدا کردی۔مگر اب بھی شہر کی آبادی میں آپ کو اطالوی خاندانی نام کثرت سے ملیں گے۔

شہر کے عین وسط میں ایک قدیم کیتھولک کلیسا ہے۔یہ چوک شہر کا مرکزی نقطہ بھی ہے اور سماجی گہما گہمی کا مرکز بھی،ایک شام اس چرچ کی خصوصی عبادت کے بعد ایک قطار میں کھڑے لوگ باری باری پادری سے سلام لے رہے تھے۔سیاحتی نقطہ نظر سے میں پہلے کلیسا میں اس پادری کا خطاب بھی سن چکا تھا اور اب ثقافتی آداب بجالاتے ہوئے لوگوں کے ساتھ قطار میں بھی کھڑا ہو گیا تھا۔میری باری آئی تو پادری نے میرے ساتھ سلام لیتے ہوئے بایاں ہاتھ بلند کر کے اس کا مکا بنایا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگادیا۔اس نعرے کو سن کر سبھی لوگ مسکرانے لگے۔

کبھی یہاں ٹیکس فری زون قائم تھا جہاں دنیا بھر سے سرمایہ کار آتے تھے۔ یہ وہ وقت

تھا جب یہاں پاکستانیوں کا طوطی بولتا تھا۔نوے فیصد پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک تھے اور انتہائی مالدار تھے۔مگر کاروباری ناموافق حالات کے سبب اب فقط چند ہی لوگ باقی بچے ہیں۔

تکنا سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ساحلی شہر ایلو ہے،جس کا نام سن کر ماضی کا مقبول بھارتی گانا''ILU ILU'' یاد آتا ہے۔ وہاں ایک دوست نے اپنے ویزے کی مدت میں توسیع کے لیے درخواست بمع رشوت جمع کروار کھی تھی۔خیر ہم دستاویزات وصول کرنے کے لیے گئے تو دن دیہاڑے دفتر میں شراب کا دور دورہ چل رہا تھا۔ پہلے تو مجھے جھٹکا لگا کہ میرے دوست کو شاید ایڈریس کی بابت کچھ غلطی لگ گئی ہے۔مگر ایسا نہیں تھا، وہ واقعی امیگریشن کا دفتر تھا۔میں نے اس ماحول اور موسیقی کے ساتھ رقص وغیرہ کا سبب پوچھا تو پتا چلا کہ آج ایک دفتری کارکن کی سالگرہ ہے۔اس لیے تھوڑا بہت جشن چل رہا ہے۔سب سے بڑے افسر نے ہاتھ میں بڑی بوتل پکڑ رکھی تھی۔ہمیں بھی اس نے شراب پینے کی دعوت دی۔میرے دوست نے بہانہ کردیا کہ اس نے گاڑی ڈرائیو کرنی ہے۔اس لیے نہیں پی سکتا، جب میں نے بھی انکار کیا تو مذکورہ افسر طنزیہ کہنے لگا کہ کیا آپ دونوں نے ہی گاڑی چلانی ہے ؟انہوں نے مذاق ضرور کیا مگر پینے پر اس سے زیادہ اصرار نہیں کیا،اور ہمارا کام بھی ہو گیا۔کیونکہ پورا دفتر ہی آج فیاضی پر آمادہ تھا اور سخاوت سے کام لے رہا تھا۔

اپنی نصف زندگی عالم کفر میں گزاری لیکن صرف ایک بار شراب پینے کے لیے اصرار کا سامنا کرنا پڑا،جنوبی افریقہ کے جہاز میں اکانومی کلاس کی تین نشستوں والی سیٹ پر میرے برابر دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔معانقے کے بعد رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور پھر انہوں نے شمپیئن کی بوتل نکال لی،وجہ بظاہر ان دونوں میں سے ایک کی سالگرہ تھی،ایک دھماکے سے بوتل کھولی گئی اور جھاگ کے ساتھ کچھ ام الخبائث بھی چھلک پڑی۔ان دونوں نے مجھے پینے کی دعوت دی اور انکار پر قائل کرنے کی کوشش میں لگ گئیں کہ دیکھو آج تم نے انکار کیا تو ہمارا دل ٹوٹ جائے گا۔میں نے اسے میڈیکل سے لیکر مذہب تک بہانہ کیا۔اسے سمجھایا کہ شراب میرے مذہب میں حرام ہے۔مگر برابر والی نشست پر براجمان فربہ

گوری خاتون تو ڈٹی رہی، کہنے لگی مگر یہ تو شمپیئن ہے۔ بھلا اس کا کیا گناہ ہوگا؟ اسے سمجھایا بی بی ایک قطرہ بھی پینا گناہ ہے۔تو اس سالگرہ والی خاتون نے التجا اور شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا کہ میری آج سالگرہ ہے، میری خاطر تم اتنا سا بھی گناہ سہار نہیں سکتے؟ خیر اسی بحث و تکرار میں کیپ ٹاؤن آ گیا۔مگر اس کے علاوہ زندگی میں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی کسی نے اس قدر اصرار کیا ہو۔

میں تکنا کا ذکر کر رہا تھا کہ جن دنوں یہ شہر پاکستانیوں سے آباد ہوا کرتا تھا تو ہر چوتھے دن کسی نہ کسی کے گھر دعوت ہوتی تھی، جسے عرف عام میں یہاں ''فیستا'' کہتے ہیں انگریزی کا لفظ ''FEAST'' اس کا مناسب متبادل ہے۔ بہت خوبصورت ماحول تھا، میرے لیے تو یہ ناسٹلجیا ہی ہے مگر اس شہر کی تاریخ کا ایک خوبصورت باب بھی ہے، جب یہاں پر ایک دہائی سے زیادہ عرصہ تک پاکستانی کمیونٹی کے افراد شہر کی معیشت میں بہت اہم، اور ہر محفل کی رونق ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا یہ سب لوگ مالی طور پر انتہائی آسودہ حال تھے۔شہر کے مہنگے ترین مکانوں میں رہائش پذیر تھے، مہنگی گاڑیاں ایک دوسرے سے مقابلے اور ضد میں رکھتے تھے۔خود بھی تقریباً تمام لوگ گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک تھے۔ ریستوران، شاپنگ سنٹر اور شب کدوں میں جانِ محفل ہوتے تھے۔

شہر سے دس کلو میٹر دوری پر حکومت نے ایک ٹیکس فری زون ''سٹی کوس'' کے نام سے قائم کر رکھا تھا، یہاں پر انہی پاکستانیوں کا راج تھے، جو تعداد میں ہمیشہ دو تین سو کے قریب ہی تھے مگر سبھی کاروباری حضرات تھے۔ گو کہ شہر میں دو پاکستانی ریستوران تھے، مگر زیادہ تر گھروں میں دیسی کھانے بنانے میں خصوصی مہارت رکھنے والی خواتین کام کرتی تھیں۔ دور دراز کے گاؤں، گوٹھوں میں دیہاتی خواتین میں اس بات کا چرچا تھا کہ اگر اچھا کام چاہیئے تو پاکستانی کھانے بنانا سیکھ لو، بہت سخی لوگ اور بے پناہ پیسے والے ہیں۔ زندگی آسان ہو جائے گی۔

ہمارے گھر میں ماریا کھانا پکاتی تھی، آٹے کی روٹی ایسی گول، نرم اور مزیدار بناتی کہ پاکستان میں بھی کم کم لوگوں کو ہی نصیب ہو پاتی ہے۔ اس مرتبہ ایک عرصے کے بعد اسی سٹی کوس میں میرا جانا ہوا۔ پرانی جاپانی گاڑیوں پر حکومت نے پابندی عائد کرنے کے سبب یہ سٹی کوس اجڑ گیا ہے۔ جہاں

ہزاروں لوگ کام کر رہے تھے، اب کل ملا کر سو افراد بھی نہیں ہوں گے۔ چاروں جانب ویرانی دیکھ کر دل بہت اداس ہوا۔ محسن نقوی کا یہ مصرعہ دماغ میں بہت دیر تک گونجتا رہا۔

؎ اس دشت میں اک شہر تھا، وہ کیا ہوا؟ آوارگی

بہرحال مجھے کسی اجڑے شہر کا نوحہ تو نہیں کہنا، اس نگر کے خوبصورت اور محبت کرنے والے لوگوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ جو آج بھی رنگ، نسل، مذہب، زبان کے اختلاف کے باوجود ہم پاکستانیوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اس شہر کی آباد مسجد اور میرے پاکستانی نژاد جاپانی دوست یاماد ااعجاز کا انگریزی سکول عہدِ رفتہ کی یاد دلاتے رہیں گے۔

ارجنٹائن۔خوابوں جیسی حسین سرزمین

بیونس آئیرس ائیر پورٹ پر جہاز لینڈ ہوتے ہی بیشتر مسافروں نے تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔دنیا کے دیگر خطوں کے مقابلے میں لاطینی امریکہ کے باسی زیادہ جذباتی اور جذبات کے اظہار میں ذرا زیادہ دلیر اور آزاد واقع ہوئے ہیں۔ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ارجنٹائن کا یہ سب سے بڑا شہر ہے اور اس ملک کا دارالحکومت بھی ہے۔ہمارے اسلام آباد اور انڈیا کے دہلی کی طرح بیونس آئیرس بھی ایک خودمختار علاقہ ہے اور کسی صوبے کا حصہ نہیں ہے۔گو کہ ارجنٹائن کے 23 صوبے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ اس ملک کو دنیا کی رقبے کے اعتبار سے آٹھویں بڑی مملکت بناتا ہے۔علاوہ ازیں رقبے کے لحاظ سے یہ ہسپانوی بولنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔

ارجنٹائن پہنچ کر پہلی خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب ہوٹل کے استقبالیہ پر کھڑے نوجوان لڑکے نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہی کہا کہ آپ کی میشا شفیع مجھے بے حد پسند ہے، کیا خوبصورت آواز میں گاتی ہے۔حیرت کا پہلو یہ ہے کہ اس نوجوان کو سوائے ہسپانوی کے کوئی دوسری زبان نہیں آتی، اردو تو بالکل بھی نہیں۔مگر موسیقی تو ایک عالمی زبان ہے، بول سمجھ میں نہ بھی آسکیں پھر بھی آپ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سات سمندر پار بیٹھا یہ شخص پاکستان کے کوک سٹوڈیو میں ریکارڈ ہونے والے سیزن 9 تک ہماری موسیقی پر کان جمائے بیٹھا ہے۔فن سے یہ لوگ پیار کرتے ہیں ۔اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو ان لوگوں نے بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔اتنی بڑی تعداد میں تھیٹر میں نے دنیا کے کسی اور دیس میں نہیں دیکھے۔حالانکہ داخلے کی سب سے سستی ٹکٹ بھی پاکستانی سات ہزار روپے کی ہے، جبکہ مہنگی تو کافی زیادہ مہنگی ہے۔شہر کے وسط میں حکومت کا قائم کردہ تھیٹر میوزیم بھی

قابلِ دید ہے۔اس میں تھیٹر کی روایت اور تاریخ کا احاطہ کرنے کے علاوہ عہد ساز ڈراموں کی تصاویر اور ملبوسات سجائے گئے ہیں۔ یہ میوزیم ایک قدیم و معروف تھیٹر کی عمارت میں قائم کیا گیا ہے۔شہر میں دن بھر کسی نہ کسی چوک اور چوراہے ہیں ''تانگو'' رقص ہوتا رہتا ہے، جو کہ ارجنٹائن کی ثقافتی پہچان ہے۔ بن سنور کر لڑکے لڑکیاں اس میں شریک ہوتے ہیں، بہت سارے ان میں سے پروفیشنل اور نیم پروفیشنل بھی ہوتے ہیں، مجمع اکٹھا کر کے یہ تانگو رقص پیش کرنے کے بعد اپنی موسیقی کی بنائی ہوئی سی ڈی فروخت کرتے ہیں۔اس کی قیمت عموماً کافی یا چائے کے ایک کپ کے برابر ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جیسے مداری اور مجمع باز تماشہ دکھا کر پہلے مجمع اکٹھا کرتے ہیں اور آخر میں کوئی دوائی بیچتے ہیں۔شاید یہی رنگا رنگی ہی وجہ ہے کہ بیونس آئرس جنوبی امریکہ میں سیاحوں کی مقبول ترین منزل اور سب سے زیادہ سیاحتی آمدورفت والا شہر قرار دیا جاتا ہے۔اس شہر میں امن وامان کی صورت حال مثالی ہے اور پھر سمندر کے ساحل نے تو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

مقامی کرنسی پیسو ہے ایک پیسو ہمارے سات روپے کے برابر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سالہا سال تک ارجنٹائن نے ڈالر اور پیسو کو آپس میں یوں نتھی کیا ہوا تھا کہ ایک پیسو، ایک امریکی ڈالر کے برابر تھا۔مگر چونکہ یہ تعلق مصنوعی طریقے سے جوڑا گیا تھا، اس فیصلے کی معاشی بنیادیں کمزور تھیں۔لہذا یہ تعلق جب ٹوٹا تو اس کے انجام کے طور پر ارجنٹائن کو بہت خوفناک معاشی بحران سے گزرنا پڑا۔ پیسو کو آزاد کرنسی قرار دے دیا گیا، بعد از خرابی بسیار، آجکل ایک ڈالر میں پندرہ پیسو آجاتے ہیں۔ارجنٹائن کی معیشت کو اگر تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو صرف ایک صدی پہلے یہ دنیا کا ساتواں امیر ترین ترقی یافتہ ملک تھا۔اس کی معاشی ترقی ہی وہ وجہ تھی کہ یہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یورپ سے ہجرت کرنے والے تارکینِ وطن کی امریکہ کے بعد سب سے مقبول منزل تھا۔ یہ تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ اس ملک کی ستر (70%) فیصد آبادی ہسپانوی اور اطالوی نسل کے لوگوں کی ہے باقی ماندہ لوگ یورپ کے دیگر ممالک یا پھر دنیا کے باقی ملکوں سے آئے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ امریکہ اور آسٹریلیا و کینیڈا کی طرح تارکین وطن کا ملک ہے۔معیشت میں گراوٹ کے باوجود یہ معاشی اعتبار سے پہلے بیس، دنیا کی مضبوط

ترین معیشت رکھنے والے مما لک میں سے ایک ہے۔

برف پوش اور سر سبز پہاڑوں، ہری بھری چراگاہوں اور میدانوں کے اس دیس کی مرغوب غذا گوشت ہے۔ یہاں اعلیٰ قسم کا تازہ گوشت ارزاں نرخوں پر دستیاب ہے اور یہ گوشت اس ملک کی برآمدات کا اہم جزو بھی ہے۔ بھنا ہوا گوشت یہاں کی زندگی اور دستر خوان کا لازمی جزو ہے۔تازہ سبزیا ں، پھل اور دودھ کے علاوہ گوشت مرغوب ومقبول غذا ہے، اسی سبب سے لوگ بہت صحت مند ہیں۔کھا نے، پینے کے شوقین لوگ بہت ہیں مگر موٹا پا نہیں پایا جاتا۔اس کی وجہ عوام کی کھیلوں کے ساتھ رغبت ہے۔یوں تو کبڈی سے لیکر ہاکی، ٹینس، گالف، سبھی کچھ یہاں اعلیٰ معیار کا کھیلا جاتا ہے مگر فٹبال کی مقبو لیت کا احوال تو بیان کرنا مشکل ہے۔ایک پورے اسٹیڈیم کو جو شہر کے وسط میں تھا، فٹبال کے عجائب گھر میں بدل دیا گیا ہے۔داخلے کی ٹکٹ پانچ صد روپے ادا کر کے اندر جائیں تو دیکھیں گے کہ ارجنٹائن کے فٹ بال کی پوری تاریخ یہاں محفوظ ہے۔سینما اسکرینیں لگی ہوئی ہیں، جن پر ہر وقت فٹ بال کے یادگا رلمحوں کی فلمیں چلتی رہتی ہیں۔میراڈونا کا گول یہ اب بھی نہیں بھولے جس نے انہیں کئی دہائیوں قبل فٹ بال کا عالمی چیمپئن بنایا تھا۔فٹبال میوزیم کے اردگرد ریستوران اور دوکانیں بھی فٹبال کے دیوانوں اور پروانوں کی ہیں۔ایک ایسے ہی ریستوران میں لنچ کیلئے داخل ہوا تو پتا چلا کہ یہاں مشہور کلب کولوکو لو کا قبضہ ہے۔جان کی امان چاہتے ہیں تو ان مردوزن کے سامنے کولوکولو کے متعلق کوئی تنقیدی جملہ زبا ن پر مت لائیں بے حد جذباتی فضا اور مزیدار کھانا۔

ارجنٹائن کے سماج کا طائرانہ جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کی سب سے مقبول شخصیا ت تین ہیں، جو کہ معروف فٹ بالر میراڈونا، بائیں بازو کے انقلابی گوریلا چے گویرا اور پاپائے روم فرانسس ہیں، ان تینوں کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ ویسے تو ہالینڈ کی موجودہ ملکہ معظّمہ میکسیما بھی ارجنٹائن میں پیدا ہو کر یہی پلی بڑھی ہیں مگر ان کی مقبولیت مذکورہ شخصیات جیسی نہیں ہے۔ پوپ فرانسس کی عالمی اہمیت تو اس وجہ سے بھی ہے چونکہ وہ پہلے غیر یورپی ہیں جو ویٹ کن میں اس بلند ترین عہدے تک پہنچے ہیں، کیتھولک کلیسا کے سربراہ کی اہمیت بالخصوص لاطینی امریکہ میں کچھ زیادہ ہے، اس کی وجہ

یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کیتھولک یہاں پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک میں ان کا تناسب اسی فیصد (80%) کے قریب ہے۔ یوں تو ایونجلیکل عیسائی مسلک شمالی وجنوبی براعظم امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا عقیدہ ہے۔ مگر ابھی تک کسی بھی ملک میں اس کے پیروکار دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں، ارجنٹائن میں ان کا تناسب نو فیصد ہے اور گیارہ فیصد لوگ لادین ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ یہاں بسنے والے یہودیوں کے برابر ہے یا پھر ان سے تھوڑے زیادہ ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان مسجد ہے جس سے ملحقہ ایک لائبریری اور اسلامک سنٹر بھی ہے۔ اس کا انتظام عرب مسلمان چلاتے ہیں۔ عالیشان مسجد کی ویرانی دیکھ کر اقبال کا وہ شعر یاد آتا ہے۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے من اپنا پرانا

پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

لاطینی امریکہ میں سب سے زیادہ یہودی اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ دارالحکومت میں جگہ جگہ آپ کو مخصوص ٹوپی ''سکّل کیپ'' سیاہ کوٹ پتلون اور سفید قمیض میں ملبوس یہودی نظر آتے ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک بڑا اور قدیم ''سینیگاگ'' ہے۔ اس معبد سے ملحقہ ایک یہودی میوزیم ہے۔ میں نے اس میوزیم میں داخل ہونے کی بہت کوشش کی مگر مسلمان اور پاکستانی شناخت ہونے کے سبب مجھے داخلے کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ میری درخواست پر غور جاری ہے، انتظامیہ کا کہنا ہے کہ آپ کو ای میل کے ذریعے مطلع کر دیا جائے گا، صاف انکار انہوں نے ابھی نہیں کیا ہے۔

بیونس آئرس کے مرکز میں تمام عمارتیں کثیر المنزلہ ہیں۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے تو یہ یورپ کا کوئی شہر معلوم ہوتا ہے، ہسپانوی اور اطالوی طرز تعمیر نمایاں ہے۔ ہسپانوی طرز تعمیر کی وجہ بھی قابل فہم ہے کہ یہ ملک صدیوں تک سپین کی نوآبادی رہا ہے اور 1810 میں اس نے آزادی حاصل کی ہے۔ لاطینی امریکہ میں ارجنٹائن ہسپانوی نوآبادیاتی سلطنت کی اسی طرح وارث ریاست ہے جس طرح سوویت یونین کی وارث روس کی ریاست ہے۔ چونکہ لاطینی امریکہ میں ہسپانوی سلطنت کا صدر مقام یہیں تھا۔ گنجان آباد اور جدید شہر ہونے کے باوجود بیونس آئرس میں ٹوکیو، نیویارک یا لندن جیسی بے

چینی اور دوڑ دھوپ نظر نہیں آتی بلکہ ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور موسیقیت یہاں کا خاصہ ہے۔ جگہ جگہ رقص و موسیقی کا دور دورہ ہے۔ لوگوں کا عمومی معیارِ زندگی کافی بہتر ہے۔ ساحل سمندر کے ساتھ بنی سڑک پر وقفے وقفے سے ملک کے اہم کھلاڑیوں کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں۔ فٹ بال ٹینس، ہاکی، باکسنگ سے لے کر جمناسٹک اور دیگر کھیلوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے موجودہ اور سابق کھلاڑیوں کے مجسمے عوامی مقامات پر نصب کرنا ان کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک قابل تقلید طریقہ ہے۔ ساحل کے ساتھ اسی سڑک پر خواتین کے لئے مخصوص ایک ٹینس کلب کا نام پڑھ کر میں دیر تک اکیلا ہی ہنستا چلا گیا۔

آپ بھی سنیے کیا تخلیقی نام ہے ''ڈارلنگ ٹینس کلب'' یقیناً آپ کو بھی زنانہ ٹینس کلب کی تانیث بیان کرنے کے لیے یہ طریقہ پسند آئے گا۔ آپ کسی بھی وقت گھر سے نکلیں، ہر وقت تازہ دم ہواؤں کے جھونکے آپ سے ٹکرانے لگتے ہیں، مگر یہ ہوائیں ''صرصر'' نہیں بلکہ ''صبا'' کی سی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان ہواؤں سے متاثر ہو کر ہی اس شہر کا نام بیونس آئرس رکھا گیا یعنی ''خوش کن ہوائیں'' یا پھر ہسپانوی زبان سے اس کا ترجمہ ''با خوش گوار'' بھی کیا جا سکتا ہے۔ سپین سے آنے والا وہ مہم جو یقیناً بہت باذوق ہوگا جس نے نیا شہر بسا کر پانچ صدیاں پہلے اس کو مدھر ہواؤں سے منسوب کر دیا۔ ان ''اچھی ہواؤں'' کا ہی فیض ہے کہ گنجان آباد اور کثیر المنز لہ ہونے کے باوجود دنیا کے دیگر میٹرو پولیٹین شہروں کی طرح یہ کنکریٹ اور اسفالٹ کا جنگل نہیں لگتا بلکہ زندہ دلوں کا شہر معلوم پڑتا ہے۔

ارجنٹائن میں سڑکوں اور چوراہوں کے نام عموماً دوست ممالک اور ان کے شہروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ ملک کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ایام سے بھی شاہراہوں کو منسوب کیا گیا ہے، جیسے 9 جولائی نام کی سڑک تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ ویسے یہ چلن ارجنٹائن تک ہی محدود نہیں بلکہ لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ گلی، کوچے، سڑکیں اہم شخصیات کے علاوہ اہم دنوں، دوست ممالک اور ان کے شہروں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ کو شاید حیرت ہو کہ یہاں ''پاکستان چوک'' بھی ہے۔ سڑکوں کے کناروں پر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اور گلیوں، بازاروں

میں گھومتے پھرتے خواتین کی اتنی بڑی تعداد سگریٹ نوشی کرتے میں نے اسی عالم رنگ و بو میں اور کہیں نہیں دیکھی، جتنی کثیر تعداد اس دیس میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میرا مطلب ہے عوامی مقامات پر اور وہ بھی آزادانہ چلتے چلتے مرد و زن کی کثیر تعداد تمبا کو نوشی میں محو نظر آتی ہے۔ اٹھائیس لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل یہ جنت نظیر ملک فقط رقبے کے اعتبار سے دنیا کا آٹھواں بڑا ملک نہیں ہے بلکہ اپنے حسن اور ثقافت کی بنیاد پر دنیا کا آٹھواں بڑا عجوبہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں کا معیاری وقت پاکستان سے آٹھ گھنٹے پیچھے ہے مگر جب یہاں پہنچیں تو لگتا ہے یہ دنیا ہی کوئی مختلف ہے۔ صرف یہاں کا موسم ہی ہم سے متضاد نہیں، یعنی دسمبر میں گرمی اور جون سخت سردی کا مہینہ ہے، بلکہ ہمارے انداز زیست اور ان کے زندگی گزارنے کے ڈھنگ میں بھی کھلا تضاد ہے۔ آخر میں یہ جملہ معترضہ کہ لاطینی امریکہ کے دیگر ممالک میں رہنے والے لوگوں کی عمومی رائے یہ ہے کہ ارجنٹائن کے لوگ ذرا مغرور ہوتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں البتہ اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔

حلال کوشر

جاپان سے لاطینی امریکہ کے سفر کے دوران ایک نئی دریافت ہوئی ،انکشاف کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔اس فضائی روٹ پر کھانا دورانِ پرواز ہمیشہ ایک اہم مسئلہ رہتا ہے۔مسلم کھانا عموماً دستیاب نہیں ہوتا۔اس مرتبہ بھی جب میں نے ٹریول ایجنسی سے حلال کھانے کی بابت گزارش کی تو جواب میں انکار تھا،پھر میں نے ویجیٹیرین کھانے کا آپشن سامنے رکھتے ہوئے سبزی خوری پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ شاکاہاری ہی بن جاتے ہیں۔مگر ماس مچھلی سے دست کش ہونے پر آمادگی کے باوجود یہ بھی آپشن دستیاب نہ تھا۔حالانکہ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ائیرلائن میں سبزی خوروں کو دیا جانے والا کھانا بہت بدمزہ ہوتا ہے۔میں نے ابھی تک کوشر کا نام تو سنا تھا مگر کھایا کبھی نہیں تھا۔بڑوں نے یہ بتایا تھا کہ یہودی ایک تو خنزیر نہیں کھاتے ،دوسرا ان کا گوشت بھی ذبح کیا ہوا ہوتا ہے۔میں نے اپنی آخری خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ٹریول ایجنٹ سے کہا کہ ''کوشر'' ہی دیکھ لو۔اس نے ترنت جواب دیا،ضرور جناب! کوشر دستیاب ہے، اس متعلق رسول اکرمؐ کا فرمان بھی ذہن
میں تھا کہ رات اگر کسی غیر مسلم کے ساتھ گزارنی پڑے تو عیسائی کا انتخاب کرو،اگر کسی غیر مسلم کے ساتھ کھانا مجبوری ہو تو پھر یہودی کا انتخاب کرو۔

ٹوکیو سے میکسیکو آتے ہوئے جب یہودیوں کا کھانا کوشر سامنے آیا تو اس میں بہت ساری باتیں قابلِ ذکر تھیں۔ایک تو یہ کہ عمومی کھانے کی نسبت اس کی مقدار،معیار اور پیشکش بہت اعلیٰ تھی۔دوسرا جب میں نے اجزاء کا جائزہ لینے کے لئے بیلجئم میں تیار کئے گئے،اس کھانے پر لگے اسٹیکر کا جائزہ لیا تو اس پر عربی زبان میں جلی حروف میں حلال لکھا ہوا تھا۔مچھلی اور فروٹ ودیگر میوہ جات کے ساتھ ڈبل

روٹی وغیرہ اس کھانے میں شامل تھیں۔سچ تو یہ ہے کہ اتنا مزیدار کھانا کھانے کا دورانِ سفر کم کم ہی اتفاق ہوا ہے۔کھانے کے ساتھ ائیر لائن نے ایک بروشر بھی فراہم کیا تھا۔جس میں اس کوشر کے حلال ہونے کی تصدیق مصر کی جامعۃ الازہر کے علماء کرام نے بھی کی تھی۔

چند سال پہلے میں نیویارک کے ایک ''سب وے'' ریستوران کی برانچ پر گیا۔جس کا نہ صرف مالک یہودی تھا بلکہ یہ ریستوران مخصوص کوشر فراہم کرتا تھا۔وہاں میں ملنے تو اپنے ایک ہم جماعت پاکستانی دوست کو گیا تھا جو کہ وہاں ملازمت کرتا تھا،مگر میں نے وہاں ایک عجیب بات دیکھی۔اس کے گاہک عمومی طور پر حلیے کے اعتبار سے دو طرح کے لوگ لگتے تھے۔ایک تو کھوپڑی پر ننھی سی ٹوپی ٹکائے،یا پھر سیاہ ہیٹ پہنے یہودی تھے،ان کے علاوہ مسلمان کثیر تعداد میں تھے۔عام گورے،عیسائی امریکی یہاں نہ ہونے کے برابر تھے۔یہودیوں کا اس ریستوران پر کھانے کے لئے کثیر تعداد میں جمع ہونا تو قابل فہم تھا کیونکہ یہ ریستوران مخصوص ہی کوشر کھانوں کے لئے تھا۔مزید میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا مالک یہودی ہے۔مگر مسلمان اتنی کثیر تعداد میں یہاں کھانا کیوں کھانے آرہے تھے؟تحقیق کرنے پر مجھے یہ جواب ملا کہ یہ کوشر کھانا حلال بھی ہے۔اسی سوچ کے تحت

میں نے دوران پرواز کوشر کھانے کی فرمائش کردی تھی۔انکشاف بعدازاں یہ ہوا کہ ہر حلال کھانا ضروری نہیں کہ کوشر بھی ہومگر ہر کوشر کھانا ضروری طور پر حلال ہی ہوتا ہے۔کوشر کھانا اگر کبھی آپ نے دوران پرواز آڈر کیا تو چاہے آپ اکانومی کلاس میں سفر کررہے ہوں یا پھر بزنس کلاس میں،کوشر کھانا آپ کو وہی دیا جائے گا جو فرسٹ کلاس کے مسافروں مخصوص ہوتا ہے۔اس کی وجہ سیکیورٹی کے خدشات ہیں،کھانا گرم کرنے سے پہلے ہوائی جہاز کا عملہ آپ کے پاس آئے گا اور کھانے کی سیل خود توڑنے کے لئے کہے گا۔مختصر یہ کہ آپ خود کو بہت وی آئی پی محسوس کریں گے۔

مے کدے کا سبق

مے خانے کی حیثیت لاطینی امریکہ کے سماج میں کم وبیش وہی ہے جو ہمارے ہاں چائے کے کھوکھے کی ہوتی ہے۔سمندر کے کنارے واقع ایک ایسے ہی
مے خانے کے باہر بیٹھا، میں سرِ شام ابھرنے والے چاند کا نظارہ کر رہا تھا۔ایک طرف بحرالکاہل کی لہروں کا شور، جسے موسیقی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔دوسری طرف مٹیلے پہاڑ ایستادہ، پرشکوہ اور ہیبت انگیز مل جل کر ایسی رومانوی فضا بنا رہے تھے جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل کیا،ممکن ہی نہیں۔بیرے نے آ کر میری ٹیبل پر رکھی شمع روشن کی اور آرڈر لکھنے کے لئے مؤدب انداز میں میز کے کنارے کھڑا ہوگیا۔میں نے اسے الکوحل کے بغیر ''پریمابیرا کاک ٹیل'' لانے کے لئے کہا۔''پریمابیرا'' ہسپانوی زبان میں موسمِ بہار کو کہتے ہیں اور یہ ایک مقبول مشروب کا نام بھی ہے۔میرے ساتھ والی ٹیبل پر ایک بوڑھا شرابی اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بنتِ انگور سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔میرا آڈر سن کر بڈھا تو گویا تڑپ اٹھا،اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:الکوحل کے بغیر ''پریمابیرا'' کاک ٹیل ایسے ہی ہے جیسے رس کے بغیر گنا ، یہاں تک آ گئے ہوتو پھر آدابِ مے کشی ہی سیکھتے جاؤ۔کھلے آسمان کے نیچے ہوا کے تھپیڑوں سے ٹمٹماتی ہوئی شمعیں اور لوک گلوکار کی گٹار کے ساتھ لائیو پرفارمنس سمندر کے اس ساحل پر جسے ''غصیلی حسینہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے،ایسا دلآویز ماحول بنا رہی تھیں کہ بڈھے شرابی کی بات ذرا بھی بری نہیں لگی۔جس پیار بھرے شرارتی لہجے میں اس نے یہ بات کہی تھی وہ کسی بھی صاحبِ دل کو بری لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ویسے بھی میری نظر میں باتوں سے زیادہ لہجہ اہم ہوتا ہے۔

بحر الکاہل کے ساحل پر ملا بڈھا مجھے آج یوں یاد آیا کہ بہت سے اہلِ قلم مریم نواز کے سیاست میں سرگرم ہونے اور بیروزگار نوجوانوں کے لئے قرضے کی سکیم کا سربراہ بنائے جانے پر تنقید کر رہے ہیں۔ دوسری جانب بلاول بھٹو زرداری کے سیاسی کردار کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ذاتی طور پر موروثی سیاست کا مخالف ہونے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ شریف فیملی کے بغیر مسلم لیگ اور بھٹو خاندان کے بغیر پیپلز پارٹی ایسے ہی ہے جیسے رس کے بغیر گنا اور مٹھاس کے بغیر شہد۔ اور بقول بڈھے شرابی کے الکوحل کے بغیر ''پریما بیرا'' ہوتی ہے۔

اصول کی بات کی جائے تو اگر ٹیچر کی اولاد کا ٹیچر بننا معیوب نہیں، دوکاندار کا بیٹا دوکاندار بن سکتا ہے۔ کھلاڑیوں کے بچے کھیل کے میدان میں اپنا نام پیدا کر سکتے ہیں، اور کاشت کار کے بچے کاشتکار بن جائیں تو کوئی بری بات نہیں ہے تو پھر سیاست دان کی اولاد اگر سیاست کے میدان اترنا چاہے تو یہ کوئی ایسی بھی بری بات نہیں ہے۔ معیار تو اخلاق و کردار ہی کو مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کے آباؤ اجداد کا غیر سیاسی ہونا سیاست کے لئے اس کی نا اہلی کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی دیا جانا چاہئے۔ بالکل اسی طرح کسی کے بزرگوں کا سیاسی کردار سیاست میں داخلے کی ممانعت کی وجہ قرار دینا انصاف نہیں ہے۔ سیاست میں موروثیت کا اس حد تک تو میں بھی مخالف ہوں کہ جاگیردار کا جو بچہ عملی زندگی میں کبھی کچھ نہیں بن سکتا اور گھر میں سب سے نالائق ہوتا ہے، اسے اپنے حلقہ اثر کا استعمال کرتے ہوئے، سیاست میں لا کر لوگوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ مگر صلاحیت اور میرٹ کی بنیاد پر کوئی شخص اگر عوام کی نمائندگی کرنے کے لئے خود کو پیش کرتا ہے تو اسے پدرانہ سیاست کی بنیاد پر نا اہل قرار دینا بھی جائز نہیں ہے۔

امریکہ بہادر میں اگر جارج بش کے بعد اس کا بیٹا جارج ڈبلیو بش صدر بن سکتا ہے اور کلنٹن کے بعد اس کی بیوی ہیلری کلنٹن صدر بننے کی کوشش کر سکتی ہے، تو پھر شریف فیملی اور بھٹو خاندان کی نئی نسل میں سے اگر کوئی عوامی حمایت کی بنیاد پر سربراہ مملکت چن لیا جاتا ہے تو امیں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ دنیا کا کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں مخصوص خاندان جمہوری سیاست کے ساتھ اس طرح

منسلک نہ ہوں جیسے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ موروثیت سیاست میں اہلیت یا نااہلی کی بنیاد نہیں ہونی چاہیئے۔ چلتے چلتے عرض کرتا چلوں کہ جاپان کے موجودہ وزیراعظم شنزو آبے کے دادا بھی دوسری جنگ عظیم کے ہنگام وزیرِ دفاعی پیداوار تھے اور جنگ کے کچھ سال بعد جاپان کی وزارت عظمٰی کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔

کولمبیا۔امن اورخوشحالی کا منتظر

چند برس پہلے میری ملاقات کولمبیا کی باغی تنظیم فارس کی ایک خاتون رکن سے ہوئی تھی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک سوشلسٹ انقلاب کے لیےعسکری جدوجہد کرنے والی یہ تنظیم گزشتہ برسوں میں مسلسل کمزور ہورہی ہے۔''فورسا آرمادار یوولوسینار یا کولمبایانا'' کی رکن سے ملاقات کوکوئی ایسا خاص واقعہ مت سمجھے،کولمبیا کی تمام تر دیہی آبادی ہی عملی طور پر فارس کی رکن ہے، جہاں جہاں شہری حدودختم ہوتی ہے۔حکومت کی عملداری بھی ختم ہوجاتی ہے۔میں نے مذکورہ خاتون سے انقلابی تحریک کے روبہ زوال ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ''نیویارک میں 11 ستمبر 2001 کوپیش آنے والا واقعہ'' مجھے اس کا یہ جواب عجیب سا لگا، بھلا امریکہ کے ورلڈٹریڈسنٹر سے اغواشدہ طیاروں کےٹکرانے کا کولمبیا کےعسکریت پسندوں کے ساتھ کیا لینا دینا؟ میرے سوال کوغور سے سننے کے بعد گبریلا نامی یہ خاتون سنجیدگی سے بولی کہ 11 ستمبرکوپیش آنے والے دہشت گردی کے واقعے کے بعد دنیا تبدیل ہوچکی ہے۔اس سانحے کے رونما ہونے سے پیش تر امریکہ دنیا بھر میں انسانی حقوق کا علمبردار ہونے کا دعوے دار تھا۔جیسے ہی کسی ملک کےعسکری ادارے اپنے شہریوں کے خلاف کسی قسم کی مسلح کارروائی شروع کرتے ،تو امریکہ بہادر انسانی حقوق کی پامالی کا شور مچا کرآسمان سر پر اٹھالیتا،مگر 11 ستمبر کے بعد انسانی حقوق کا منترپس منظر میں چلا گیا اور دہشت گردی کے خلاف جنگ اولین ترجیح بن گئی۔ایسے عالم میں فارس اوراس نوع کی دیگر تنظیموں کے خلاف ریاستی اداروں کی کارروائی کے لیے ماحول سازگار بن گیا۔وہ امریکہ جوکبھی انسانی حقوق اورشخصی آزادیوں کا چمپئن کہلانا پسند کرتا تھا،اب مسلح گروہوں کے خاتمے کے لیےشورش زدہ ممالک کو مالی وعسکری امداد دینے لگا ہے ۔میرے خیال میں

تامل ٹائیگرز کے خاتمے کی دیگر وجوہات کے علاوہ امریکہ کا یہی بدلا ہوا رویہ بھی اہم وجہ ہے۔ سری لنکا میں خانہ جنگی کے آخری سال چالیس ہزار افراد سیکیورٹی اداروں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے مگر اقوام متحدہ سمیت کہیں بھی کسی نے ان میں سے ماورائے عدالت قتل ہونے والوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

FARC کا بحیثیت ایک گوریلا تنظیم پوری دنیا میں تعارف موجود ہے۔ بائیں بازو کے دوست انہیں حق پرست انقلابی خیال کرتے ہیں جبکہ دائیں بازو کے لوگ دہشت گرد، لٹیرے اور قانون شکن بدمعاش سمجھتے ہیں، جن کا گزر اوقات اغوا برائے تاوان اور منشیات کی فروخت پر منحصر ہے۔ میرے دوست کی پھوپھی کو تیرہ سال کی عمر میں FARC کے لوگ جنگل میں لے گئے اور وہ پھر کبھی گھر نہیں لوٹی اور نہ ہی کسی طرف سے اس کی کبھی خبر آئی کہ وہ کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا پھر مر کھپ گئی ہے۔ اس تذکرے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کولمبیا میں ہزاروں لاکھوں گھروں کے پاس ایسی ہی دردناک کہانیاں ہیں۔

1964 میں قائم ہونے والے اس انقلابی گوریلا تنظیم کا بنیادی منشور تو زرعی اصلاحات کا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ جب اس نے طاقت پکڑی تو معاشرے میں عدم مساوات کے خلاف جدوجہد کرنے والی اس تنظیم کے بعض ارکان غیر قانونی کاروائیوں میں بھی ملوث ہو گئے۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ بعض عادی مجرموں نے بھی اسی تنظیم کی چھتری کے نیچے پناہ ڈھونڈ لی مگر جرم سے اپنا رشتہ استوار رکھا، ان کا مارکسسٹ، لیننسٹ نظریات سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی کسی ازم میں دلچسپی تھی۔

اطالوی مہم جو جہازران کرسٹوفر کولمبس کا اس سرزمین سے بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا، مگر نوآبادیاتی نظام کا شکار ہونے کے سبب اس سے منسوب ہونے والے دیس کی پانچ کروڑ آبادی کی غالب اکثریت قدیمی مقامی نسل کے افراد پر مشتمل ہے۔ لیکن یورپی نوآبادیاتی اثرات بھی آبادی میں واضح نظر آتے ہیں۔ کولمبیا کے ہمسایہ ممالک پیرو، برازیل اور ایکواڈور میں بھی بائیں بازو کی جماعتیں انتہائی طاقتور ہیں۔ نوآبادیاتی عہد کی جہاں بے شمار قباحتیں اور یورپی اقوام کی جانب

سے سادہ لوح لوگوں کا استحصال کرنے کی لرزہ خیز داستانیں ہیں، وہیں چند اچھی تبدیلیاں بھی دنیا نے دیکھی ہیں، یہ اچھے اقدامات گرچہ فاتح اقوام کی نیت اور منشاء قطعاً نہیں تھے، جیسے برصغیر میں ریل کا نظام تو شائد انگریز نے خام مال یہاں سے برطانیہ منتقل کرنے کے لئے بچھایا تھا مگر اس نے عام لوگوں کی آمدورفت بھی آسان اور تیز رفتار بنا دی۔اسی طرح سامراجی اہلکار اقوام میں مقبولیت پانے کے بعد لوگ ایتھوپیا اور افریقہ کے دوسرے ممالک سے کافی لے کر اپنے براعظم میں آئے۔یورپ وہاں سے ہی ہسپانوی لوگ اسے اپنے ساتھ لے کر لاطینی امریکہ آ گئے۔دلچسپ بات یہ ہوئی کہ کولمبیا کی زمین اور مٹی کافی کے پودوں کو بھا گئی۔افریقہ کی اس کافی نے کولمبیا کی سرزمین میں رچ بس کر ایسی فصل دی کہ پوری دنیا میں ''کیفے دی کولمبیا'' ایک ضرب المثل بن گئی۔آج اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ کولمبیا کی کافی دنیا میں سب سے مزیدار اور مقبول ہے تو اس مشروب کو محبوب گرداننے والے شائد کسی بھی شخص کو مجھ سے اختلاف نہیں ہوگا۔

پسِ تحریر:۔

نصف صدی سے زائد عرصے تک انقلابی جدوجہد اور عسکری مزاحمت کے بعد گوریلا تنظیم FARC اور حکومت کے درمیان 2016 میں معاہدہ طے پا گیا۔گوریلوں کی غالب اکثریت نے ہتھیار پھینک کر عام آدمی کی سی زندگی قبول کر لی اور امن کا ایک دور شروع ہوا چاہتا ہے۔ترقی اور خوشحالی کے اس نئے دور کے آغاز پر کولمبیا کے بہادر عوام کے لئے نیک تمنائیں۔

کیا ہوئے وہ سوداگر جو رونق بازار تھے

ہوانا میں ایک مشہور دوکان ہے جو صرف زپ مرمت کرتی ہے۔اب زپ کا اردو ترجمہ مجھے نہیں معلوم جس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔کیوبا کی فقط اس ایک دوکان کا ذکر ہی کیا، بے شمار ایسے کاروبار ہیں جو پرانی اشیاء کی مرمت میں مہارت رکھتے ہیں۔بالخصوص موٹر گاڑی کے مستری تو کمال کرتے ہیں، ستر سال پرانی گاڑیاں بھی یوں جگ مگ کرتی ، چم چم چلی جارہی ہیں کہ نئی نویلی دلہن کا روپ یاد آتا ہے۔ ہمارے بازاروں میں بے شمار ایسے کاروبار تھے جو ہماری آنکھوں کے سامنے شروع ہوئے ،نقطۂ عروج پر پہنچے اور پھر معدوم ہوگئے۔اب ویڈیو سنٹر کو ہی لے لیجئے ، پاکستان پر ہی موقوف کیا، پوری دنیا میں شہر شہر، گاؤں گاؤں یہ فلموں کے کیسٹ کرائے پر فراہم کرتے تھے۔جیسے آج کل نیٹ فلیکس اور پرائم ویڈیو ہے، یہی کام مقامی طور پر گلی کی نکڑ پر واقع دوکان اور عالمی سطح پر بلاک بسٹر نامی کمپنی کی دوکانیں کیا کرتی تھیں۔ چہار دانگ عالم ایسی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔گلی محلے کے یہ ویڈیو سنٹر وی سی آر بھی کرائے پر فراہم کیا کرتے تھے،رات بھر کرائے پر یہ بھجواتے ہوئے ساتھ چار، پانچ فلمی کیسٹ بھی دیا کرتے تھے۔دوست احباب پیسے جمع کر کے پارٹی کرتے اور فلمیں دیکھتے۔ ہمارے سامنے یہ کاروبار معدوم ہوگیا۔نیٹ فلیکس کے مالکان اپنی کمپنی بلاک بسٹر کو بیچنا چاہتے تھے،اب خود ہی یہ اس کا متبادل بن سامنے آ گئی ہے۔

گیت اور موسیقی بھی آڈیو کیسٹ پر سنی جاتی تھی اور یہ کیسٹ بیچنے والی دوکانیں میوزک سنٹر کہلاتی تھیں۔ویڈیو سنٹرز کے مقابلے میں میوزک سنٹرز کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ان میں سے کئی

میوزک سنٹرز ماضی بعید میں گراموفون بھی بیچتے تھے، جسے عرف عام میں ''توا'' کہا جاتا تھا۔آپ نے پنجابی محاورہ کسی کا ''توا'' لگانا تو ضرور سنا ہوگا؟اس کا ماخذ یہ گراموفون ہی تھا، حیرت کی بات ہے کہ یہی محارہ عالمی سطح پر انگریزی میں بھی مستعمل ہے ''BROKEN RECORD'' جسے ہم ''توا'' کہتے تھے، انگریز لوگ اسے ''ریکارڈ'' کہتے ہیں۔اورٹوٹے ہوئے ،شکستہ ریکارڈ کی تعریف یہ ہے کہ وہ بار بار ایک ہی بات ،گیت دہرائے جاتا ہے۔اب نہ ہی گراموفون رہے اور نہ ہی ان پر چلنے والے ریکارڈ،ان کی جگہ لینے والے میوزک سنٹر بھی معدوم ہوگئے جو پہلے کیسٹ اور پھر میوزک سی ڈی فروخت کیا کرتے تھے۔ویڈیو گیمز کی دوکانیں اب نظر نہیں آتیں۔ایک وقت تھا جب یہ ایک مقبول پیشہ ہوا کرتا تھا۔اب بچے زیادہ تر گھروں میں ہی کھیلتے ہیں۔کچھ خوشحالی کے سبب اور پھر ٹیکنالوجی کی جدت نے ویڈیو گیمز کو گھر میں کھیلی جانے والی تفریح میں تبدیلی کر دیا ہے اور گیمز سنٹر کہلانے والی دوکانیں بند ہوگئی ہیں۔

کاتب اور خوش نویس تو صدیوں کی تاریخ رکھتے تھے۔کون سا ایسا شہر تھا اس عالم رنگ وبو میں جہاں ان کا وجود نہیں تھا؟ والدین بچوں کو خوش خطی سکھانے کے لئے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔کمپیوٹر ایجاد ہوا تو گمان بھی نہ تھا کہ یہ کاتبوں کو بے روزگار کر دے گا۔ہمارے اساتذہ فرماتے تھے کہ شاعری کسی کاتب کے ہاتھ سے تحریر کردہ ہی اچھی لگتی ہے۔مگر وہ عہد تمام ہوا۔کیا عزت وتکریم ہوا کرتی تھی ان کاتب حضرات کی؟نئی نسلوں کو تو گمان بھی نہ ہوگا کہ کیسے ارب پتی پبلشرز اور نامور مصنفین ان خوش نویسوں کی خوشامد کیا کرتے تھے۔

یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں ٹائپ رائٹر ہم سے بہت پہلے ہی ان خوش نویسوں کو بے روزگار کر چکا تھا۔ہمارے ہاں ٹائپسٹ ایک الگ پیشہ اور بازار کی رونق ہوا کرتے تھے۔یہ بابو ٹائپ لوگ انگریزی کے ماہر شمار ہوتے تھے۔یہ لوگوں کو درخواستیں،خطوط اور دیگر دستاویزات ٹائپ کر کے دیتے اور اپنا روزگار کماتے تھے۔ہم نے اپنی آنکھوں سے ان کا عروج ،زوال اور پھر خاتمہ دیکھا۔اب دنیا میں کوئی کمپنی بھی نیا ٹائپ رائٹر نہیں بناتی ہے اور استعمال شدہ ٹائپ رائٹرز بھی میوزیم سے متعلقہ چیز

بن کررہ گئے ہیں۔ہمیں یاددلاتے ہیں کہ یہ کمپیوٹر کتنے کاروبارکھا گیا ہے۔

یادآتا ہے کہ بازاروں میں بہروپئے بھی ہوا کرتے تھے،وہ کسی بھی شعبے سے متعلق سنجیدہ شخص کا بہروپ بنا کرآتے ،پھراپنی حقیقت بیان کرکے انعام پانے کی درخواست اورامیدرکھتے۔منو بھائی نے بہروپیے کے نام سےاس موضوع پرایک افسانہ نما کالم لکھ چھوڑا ہے،جس میں اس طبقے کے معدوم ہونے کا سبب یہ لکھا ہے کہ ہرشعبے کی ٹاپ پوزیشن پراب کوئی بہروپیا بیٹھا ہے،اس لئے یہ پیشہ ختم ہوگیا ہے۔

نئی فلم سینما میں نمائش کے لئے آنے سے پہلے پورے شہر میں ڈھنڈورا پٹتا تھا۔ساتھ سازندے بھی ہوا کرتے جوشہر بھر کا گشت کرتے ،ان کے ساتھ ہاتھ سے بنے ہوئے فلم کے پوسٹر ہوتے تھے۔اب نہ وہ ڈھنڈورچی رہے اورنہ ہی مصور جوخوبصورت پوسٹر ہاتھ سے بناتے تھے۔زیادہ ترسینما مسمارکردیئے گئے ہیں۔اب فلمیں بھی نہ ہونے کے برابر بنتی ہیں جس کی یہ نمائش کیا کرتے تھے۔

جتھے گئیاں بیڑیاں،او تھے گئے ملاح

ٹیلی فون اتنا عام نہیں ہوا کرتا تھا۔امیرلوگوں کے گھروں میں ہی یہ سہولت ہوا کرتی تھی۔سرکاری ٹیلی فون ایکسچینج سے کال کرنے کی عوامی سہولت تھی۔بازار میں البتہ جگہ جگہ پبلک کال آفس ہوا کرتے تھے۔یہاں سے ٹیلی فون کرنے کی سہولت تو ضرورتھی مگر یہ بہت مہنگے تھے۔اب تو ٹیلی فون کرنے کے بوتھ بھی ختم ہوگئے ہیں اور پی سی او بھی باقی نہیں رہے۔

اک بستی دور افتادہ۔۔ پیکا

خدا کی قسم اس چھری کو آج تک خنزیر سے چھوا تک نہیں ہے۔ یہ خصوصی طور بکرے کاٹنے کے لئے ہے، فرط جذبات سے بڑھیا کے انگاروں کی طرح دہکتے سرخ گال اور سکڑتے ہوئے ہونٹ مجھے اب بھی اچھی طرح سے یاد ہیں۔ قدرے زنگ آلود، آٹھ انچ لمبی چھری اس نے جس انداز میں لہراتے ہوئے پیش کی تھی، اس سے متاثر ہونے کی ایک وجہ شاید ہمارا اندرونی خوف بھی تھا۔ موٹی بڑھیا بہت جذباتی انداز میں اپنا موقف بیان کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، ہمیں اس نخلستان نما زرعی رینچ میں آتا دیکھ کر وہ ہماری نیت بھانپ گئی تھی، بھاگی بھاگی باورچی خانہ نما کمرے کے اندر سے محفوظ کی ہوئی پاک چھری لے آئی تھی، جسے مسلمان ذبیحہ کے لئے استعمال کرتے ہیں، ہماری ہچکچاہٹ ختم کرنے کے لئے اس نے گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے چند سینئر پاکستانیوں کا ذکر بھی کر دیا۔

عید قربان کے دن ہیں۔ پردیسیوں کی عید عموماً پھیکی پھیکی سی ہوتی ہے۔ عام طور پر بجھی بجھی سی گزر جاتی ہے۔ عید کا صحیح مزہ تو اپنے وطن میں اپنے لوگوں کے درمیان آتا ہے۔ خاندان کے افراد اور دوستوں سے ملاقات، فضا میں عید کی خوشیوں کی لہریں تیرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ قربانی کے گوشت کی مخصوص مہک اور خون کے علاوہ آلائشوں کی بو مل جل کر ایک فضا بناتی ہیں جو کہ ہماری عید کا خاصا ہے۔ مجھے چند سال پہلے اناڑی ہاتھوں سے کی گئی ایک قربانی کی یاد آ گئی ہے جس کا ابتدائی منظر آپ کے لئے پیش کیا۔ دور افتادہ براعظم جنوبی امریکہ کے ایک ساحلی پٹی نما ملک چلی کے آخری ریجن تاراپاکا میں ایک گاؤں نما بستی جسے نخلستان کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ قدرے بلندی پر واقع، بے آب و گیاہ ویرانے صحرا میں یہ سبزے کا ٹکڑا، ہریالی کی چھوٹی سی چادر بچھی ہوئی ہو جیسے۔ عید کے دن عموماً اکثر پاکستانی اسی ٹیلے

نمائستی کارخ کرتے ہیں۔بالخصوص بڑی عید پر جب قربانی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔اس صورت میں یہ تفریحی مقام ہوتا ہے۔چند پاکستانیوں نے یہاں ذاتی زرعی فارم بھی خرید رکھے ہیں۔

ساحل سمندر سے گیارہ ہزار میٹر کی بلندی پر واقع اس نخلستان کا نام پیکا ہے اور اس کی آبادی چار ہزار ہے۔میلوں دور تک اس کے اردگرد ویرانہ ہے۔ساحل سمندر کا ذکر اس لیے کیا کہ مجھ سمیت تمام پاکستانیوں کا کاروبار اور رہائش سمندر کے کنارے واقع شہر اقیقے میں ہے،ٹیکس فری زون قرار دیئے جانے کی وجہ سے گزشتہ تقریباً نصف صدی سے دنیا بھر کے سرمایہ داروں کی توجہ کا مرکز اور کاروباری گہما گہمی کا مرکزی نقطہ بنا ہوا ہے۔پیکا نخلستان اس شہر سے ایک گھنٹے کی دوری، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایک گھنٹے کی چڑھائی پر واقع ہے۔انتہائی پرفضا مقام ہے۔یہاں کے لیموں کی ترشی پورے چلی میں مشہور ہے اور یہاں کے آم ہم پاکستانیوں کو بہت پسند آتے ہیں۔اب سات سمندر پار چونسہ ،لنگڑا،سندھڑی ،دیسی تو یہاں ملنے سے رہے۔چھٹی کا دن اور پھر عید کا تہوار ہونے کے سبب تمام دن چونکہ یہیں بسر کرنے کا ارادہ تھا،اس لئے رانچ کے اردگرد کا ماحول جانچنے کے لئے قربانی کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ ایک مقامی باشندے نے مجھے کہا کہ تمہیں دریا دکھاتا ہوں،اب فارسی میں تو سمندر کو دریا کہتے ہیں اور پھر پانچ دریاؤں کی دھرتی میں جنم لینے کے سبب جب بھی کوئی دریا کا ذکر کرتا ہے تو راوی، چناب، ستلج ،سندھ دریا ذہن میں آتے ہیں۔حالانکہ میں نے تو یہ کہیں پڑھ رکھا تھا کہ پیکا میں کوئی گرم چشمہ ہے مگر شاید میرے دوست نے مبالغے سے کام لے لیا ہو۔اب جائے وقوعہ پر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا، جسے وہ دریا Rio کہہ رہا تھا اس سے زیادہ پانی ہمارے گلی محلوں کی نالیوں میں بہہ رہا ہوتا ہے۔میں نے اس سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ بہت فٹے منہ تم پر بھی اور در فٹے منہ تمہارے اس دریا پر بھی۔مگر گردوپیش پر نظر ڈالی تو تمام شکوے شکایتیں جاتی رہیں،قدرت کا حسین شاہکار ہے یہ نخلستان۔

غربت اور اس سے منسلک بے چارگی بھی یہاں کے لوگوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ایک خاتون سے پوچھا کہ یہاں کہیں سے تربوز مل سکتا ہے؟ جواب میں کہنے لگی کہ ضرور ملے گا۔یہاں کے تربوز بہت میٹھے اور مزیدار ہوتے ہیں۔میرے پاس جب پیسے ہوتے ہیں تو میں بھی خرید کر شوق سے کھاتی

ہوں۔ بڑے احسن انداز میں خندہ پیشانی سے اس نے ہماری رہنمائی کی۔ مضافات کے لوگوں میں ایک خاص طرح کی بے ساختگی اور گرمجوشی ہوتی ہے، یہ دل نوازی شہروں میں بسنے والے لوگوں میں کم پائی جاتی ہے۔ یورپ کے دیگر ممالک کی نسبت سپین کے لوگوں میں مسلمانوں سے اجنبیت کم پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ایک ہزار سال پر محیط وہاں عرب مسلمانوں کا اقتدار بھی ہوسکتی ہے۔ ہسپانوی زبان پر عربی کے بہت گہرے اثرات ہیں۔ تیس ہزار عربی زبان کے الفاظ کا ہسپانوی لغت کا حصہ ہونا اہم بات ہے مگر میرے نزدیک زبان کی گرامر اور بنیادی قوائد وضوابط کو عربی زبان نے بہت زیادہ متاثر کیا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم بات ہے۔ مثال کے طور پر ہسپانوی زبان کے دو بہت ہی اہم سابقے ہیں ''EL'' اور ''LA'' یہ دونوں عربی کے ''ال'' اور ''لا'' ہیں۔ ہم جس بستی پیکا کا ذکر کر رہے ہیں اس کے صوبے کا نام ال تماروگال ہے، اور اس نخلستان کو بھی عموماً ''لا پیکا'' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ اسی نگری میں پیدا ہو کر پلنے، بڑھنے والا ایک میرا دوست جو پولیس کیپٹن ہے اور ظالمانہ حد تک صاف گو بھی ہے، کہنے لگا آپ اور ہم ہسپانوی ورثے کے لوگ ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں، یہ میرے کالے بال اور آنکھوں کی رنگت عربوں کی مہربانی سے ہے۔ ہمارا اور آپ کا خون ایک ہے۔ لاطینی امریکہ میں یہ بات اب بھی فخر کی علامت سمجھی جاتی ہے، اگر کسی کے آباؤاجداد سپین یا یورپ کے کسی بھی ملک سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہوں، آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یورپی پس منظر کے لوگوں نے ہی زیادہ تر لاطینی ممالک پر حکمرانی کی ہے۔ مذکورہ پولیس والا دوست بھی نسلی اعتبار سے ہسپانوی ہے۔

واپسی گھر کی طرف لوٹتے ہوئے شام ہوگئی رات کے پہلے پہر صحرا سے آسمان کی طرف دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ رات کو ایسا تاروں بھرا آسمان میں نے دنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا۔ یہاں سے ستارے اور آسمان بہت ہی قریب لگتے ہیں۔ اتنے قریب کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تھوڑی سی کوشش کریں تو انہیں با آسانی چھوا جاسکتا ہے۔ اس صحرا میں جنگلی حیات کا تو کوئی وجود نہیں اور نہ ہی انسانوں کی کوئی بستی درمیان میں ہے۔ دور دور تک کسی ٹریفک کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔ میں نے گاڑی سڑک کے کنارے روک لی اور انجن بند کر کے باہر آ گیا۔ بہت دیر تک آسمان کو دیکھتا رہا۔ اتنی خوبصورتی زندگی میں کم ہی ایک جگہ

یکجا دیکھی ہے۔مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے زمانہ طالب علمی کے Ecology کے پروفیسر یاد آ گئے۔ایک دفعہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان سے ملنے کالج گیا اور بتایا کہ میں آج کل چلی میں رہ رہا ہوں۔ان کا کہنا تھا کہ میری خواہش مرگ ہے کہ چلی دیکھوں۔ڈیتھ وش کا یہی ترجمہ سمجھ آتا ہے۔انہوں نے ارضیاتی حوالے سے جو باتیں بتائیں وہ اب بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔اور اس علاقے کا انہوں نے ذکر خاص طور پر کیا تھا۔

اب صحرا میں آسمان پر تاروں کا جھرمٹ دیکھا تو ان کی خواہش مرگ والی بات بہتر انداز میں سمجھ میں آئی ہے۔اس علاقے کی جغرافیائی حیثیت کے سبب دنیا بھر سے سیاح یہاں تاروں بھرے آسمان کا نظارہ کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔انہی سیاحوں کی آمد کے پیش نظر ایک خوبصورت ہوٹل قائم کیا گیا ہے۔اسے رصدگاہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔کیونکہ اس کو اس انداز میں بنایا اور چلایا جاتا ہے،یعنی رات کا آسمان واضح طور پر دیکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانی ہو سکے۔روشنی اور رنگوں کا انتخاب ایسا کہ قدرتی منظر کی خوبصورتی متاثر نہ ہونے پائے۔آسمان اور ستاروں کی قربت زیادہ سے زیادہ محسوس کی جا سکے۔ہوٹل اور ہوسٹل تو چند ایک اور بھی قابل ذکر ہیں۔مگر اصل کمال تو قدرت کا ہے جس نے اسے یوں تخلیق کیا،اس نخلستان سے رات کو آسمان کی طرف دیکھیں تو تارے زمین پر اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔دھرتی اور آسمان آپس میں ملاپ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

سمندروں کے سفر پہ نکلو

لاطینی امریکہ کے مچھیروں کا کہنا ہے کہ سمندر ایک عورت ہے۔لہروں کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ جب یہ ساحل کی طرف آتی ہیں تو خوشیاں ساتھ لے کر آتی ہیں،اور جب واپس سمندر کی طرف پلٹتی ہیں تو غموں کو اپنے ساتھ سمندر میں بہا کر لے جاتی ہیں۔شاید یہ امید اور عقیدہ ہی ساحل کی طرف آنے کی وجہ بنا۔خیر سمندر کی طرف آنے کے اسباب میں چھٹی کا دن اور ذہنی فراغت بھی شامل تھی۔بحرالکاہل کے جس ساحل کے کنارے آج دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھا ہوں یہ لاطینی امریکہ سے کم از کم دس ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے،مگر آج جاپان کے مضافات میں اس دورافتادہ ساحلی بستی میں پہنچتے ہوئے میں نے جو مشترکہ چیز محسوس کی وہ ساحل کی ہوا میں رچی بسی ایک سی خوشبو ہے۔میں نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے ہوا کے لمس کو اپنے چہرے پر اور ساحلی ہوا کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیا تو ایک لمحے کے لئے تو بالکل یہی احساس ہوا جیسے میں چلی،پیرو یا ارجنٹینا کے کسی ساحل پر کھڑا ہوں۔ہوا میں رچی بسی ویسی ہی نمکین نمی کا احساس ہزاروں میل دور سمندر کے دوسرے کنارے پر بھی ہوتا ہے۔سمندر کے پانی کا رنگ ،اس کی جھاگ اڑاتی منہ زور لہریں اور مخصوص نمکین ذائقہ بھی بالکل ویسا ہی ہے۔یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ دیگر سمندروں کا رنگ،خوشبو،ذائقہ الگ ہے۔یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا ہر سمندر کی اپنی فضا ہے اور مخصوص آب وہوا کے علاوہ آبی حیات اور ساحلوں پر پائے جانے والے چرند و پرند تک مختلف ہیں۔

سمندر کبھی کبھی بیمار بھی ہو جاتا ہے۔جیسا کہ ابھی آپ سے لاطینی مچھیروں کا تذکرہ کیا،ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سمندر ایک زندہ چیز ہے۔ساگر کو ناری قرار دینے کا سبب تو طویل عرصے تک لہروں کے رحم وکرم پر رہنے اور خواتین سے ماہی گیروں کی دوری بھی ہوسکتی ہے۔مگر سمندر کے بیمار ہونے کی دلیل کے

طور پر میرے دوست سرخیو آلیخاندرو راویرو نے سمندر میں مجھے ایسی جگہیں دکھائیں، جہاں پانی زرد رنگت اختیار کئے ہوئے اور ٹھہرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔اس کی وجہ اس نے مجھے فضائی آلودگی اور وہ آلائشیں بیان کیں جو ہم انسان سمندر برد کر دیتے ہیں۔ہم مچھلیاں پکڑنے گہرے سمندر میں گئے تھے مگر مچھلی تو کیا اس کا کوئی نومولود بھی ہمارے ہاتھ نہ آیا۔اس کی وجہ ہماری بے ہنری کے علاوہ اس دن سمندر میں غیر معمولی حرکت تھی، پانی میں حرکت زیادہ ہو تو مچھلی پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہم ماہی گیری کے لئے تاخیر سے نکلے تھے،ماہر مچھلی مار علی الصبح فجر کے وقت نکلتے ہیں۔مجھے تو نامراد خالی ہاتھ گھر لوٹنے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا،سرخیو کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ سویرے گھر میں اعلان کر کے نکلا تھا کہ ہم مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں، ہماری واپسی تک ہنڈیا کا مصالحہ اور دیگر لوازمات تیار رکھیے گا،آج ہمارے ہاں مچھلی ہی پکے گی۔

اس مشکل کا بڑا آسان حل یوں ڈھونڈ لیا گیا کہ مچھلی منڈی کا رخ کیا، جو کہ عین ساحل پر ہی واقع ہے۔وہاں سے سرخیو نے تین بڑی بڑی سنہری مچھلیاں خریدیں اور گھر پہنچتے ہی بیوی ،بچوں کو بتایا کہ سمندر سے ابھی تازہ پکڑ کر لائے ہیں۔اہل خانہ نے شک وشبہ سے بالاتر ہو کر،اسے ایک عظیم مچھیرا قرار دے دیا،اس کے قابل رشک کارناموں میں آج کی ماہی گیری بھی شامل ہوگئی۔مسئلہ تب پیدا ہوا جب اس کے ناخلف بیٹے نے پاکستانی دوستوں کے درمیان بیٹھ کر اس دن کا تذکرہ کر دیا جب اس کے والد سنہری مچھلی پکڑ کر لائے تھے۔''دورادو'' نسل کی مچھلی کا لفظی ترجمہ یہی بنتا ہے، ہمارے مقامی مچھیرے ہو سکتا ہے اسے کسی اور نام سے پکارتے ہوں۔پاکستانی دوست چونکہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ کیسے مچھلی پکڑے بغیر لوٹنے کی خفت مٹانے کے لئے سرخیو نے ،مچھلی منڈی سے سنہری مچھلیاں خریدی تھیں اور وہی گھر لے کر گیا تھا،اس لئے انہوں نے اصل صورت حال گوش گزار کرنے کے علاوہ تمسخر بھی اڑایا۔بیٹے کو ناخلف قرار دینے کی وجہ البتہ دوسری ہے، جو کہ الگ مضمون کی متقاضی ہے، کہ کیسے اس نے باپ کی پچاس ملین ڈالر کی کمپنی دیوالیہ کروا کے ایک ریستوران کھولا، پھر اس ریستوران کو دیوالیہ کروا کے اب کسی اور کے ریستوران میں باورچی کی نوکری کر رہا ہے۔لوک دانش سے بھرپور ضرب المثل یاد آتی ہے۔

؎ پوت سپوت تو کیوں دھن سوچے

پوت کپوت تو کیوں دھن سوچے اصل دولت تو اولاد ہی ہوتی ہے،اسی کے لائق اورنالائق ہونے پرمنحصر ہوتا ہے کہ خاندان کا مستقبل کیسا ہوگا۔ویسے زیادہ موزوں تو یہاں پنجابی کی مثال محسوس ہوتی ہے کہ بیوقوف بیٹے کی پیدائش سے نابینا بیٹی کی ولادت بدر جہا بہتر ہے۔

؎ ببّل پت نہ جمّے دھی انّی چنگی

ساحلوں کی ریت ایک جیسی خوشبو پیدا کرتی ہے مگر سیپیاں الگ الگ دیسوں میں مختلف انواع واقسام کی ہیں۔یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ساحلوں کی خوشبو سے مراد بحر الکاہل کی ساحلی خوشبو ہے۔بحر اوقیانوس اور بحر ہند کے ساحلوں کی خوشبو قطعی مختلف ہے۔یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ہر سمندر کی خوشبو منفرد اور بے مثال ہے۔اس کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت پر اثرات بھی مختلف ہیں۔ہمالیہ کے دامن سے اٹھ کر جاپان آنے والے ایک نیپالی دوست نے اپنی آمد کا سبب یہ بیان کیا کہ بحر الکاہل کی ہوا سے اس کا جسم زیادہ مضبوط اوراعصاب پر اس مہا ساگر کی ہوا مثبت اثرات مرتب کرے گی۔ان میں نئی توانائی بھرنے کا موجب بنے گی۔مگر جلد ہی ہمیں محسوس ہوا کہ وہ اپنی بیگم سے جس درجہ خوف کھاتے ہیں،بحر الکاہل کی ہوا کیا،سات سمندروں کی ہوا اوران کا پانی مل کر بھی اس کمزوری کا علاج نہیں کر سکتے۔جس کا وہ شکار تھے،بقول شخصے وہ کسی جسمانی کمزوری کا نہیں بلکہ زن مریدی کا شکار تھے۔جو ان کے نزدیک لاعلاج مرض ہے۔

طالب علموں کے لئے عرض کرتا چلوں کہ ہماری دنیا کا 70 فیصد حصہ سمندروں پر مشتمل ہے اور باقی تیس فیصد خشکی ہے۔سمندروں کا ذکر کریں تو بحر لکاہل سب سے بڑا اور پھیلا ہوا سمندر ہے۔اس کے بعد بحر اوقیانوس اور بحر ہند کا نام آتا ہے۔میں نے سات سمندروں کا تذکرہ محاورتاً کیا ہے،چونکہ دنیا میں ان کی اصل تعداد ذرا مختلف ہے۔ادب اور تاریخ کی کتابوں میں مگر یہ سات شمار کیے جاتے ہیں۔نویں صدی عیسوی میں عرب مصنف یعقوبی نے لکھا ہے کہ چین پہنچنے کے لئے سات سمندروں کو پار کرنا پڑتا ہے۔عالمی سطح پر الیعقوبی کے نام سے مشہور عرب جغرافیہ دان اور مصنف،جو بنو عباس کے عہد میں گزرے ہیں،ان کو دنیا بھر میں عالمی ثقافت کا پہلا تاریخ دان قرار دیا جاتا ہے۔ویسے تو کھینچ تان کر،شمالی،جنوبی تقسیم کر کے سات سمندر بنا دیے جاتے ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔البتہ یہ حقیقت ہے کہ ہماری زمین پر پائے جانے

والے مجموعی پانی کا 97 فیصدانہی سمندروں میں موجود ہے۔سمندری لہروں کی آواز مجھے تو بے حد پسند ہے،ایک لمحے کوتو سحر طاری کر دیتی ہے۔نا قابل بیان ذہنی سکون محسوس ہوتا ہے جب لہروں کوساحل کی طرف آگے بڑھتے اور پھرواپس سمندر کی طرف پلٹتے دیکھتے ہیں۔مجھے نوبل انعام یافتہ شاعر،سفارت کاراورسیاست دان پابلونرودایاد آ گیا،اپنی جلاوطنی کے کچھ مہینے اس نے اٹلی کے جزیرے کیپری میں گزارے تھے۔وطن واپسی کے بعداس نے کیپری میں اپنے دوستوں سے فرمائش کی تھی کہ جزیرے کے ساحل پرجا کرسمندر کی لہروں کی آوازریکارڈ کر کے اسے بھیجی جائے،ایک ترقی پسند دوست نے کامریڈنرودا کی یہ خوبصورت فرمائش بخوبی پوری کردی تھی۔

تاراپاکا گاؤں

بڑھیا بڑے تحمل سے پرسکون لہجے میں بات کر رہی تھی۔ پانچ صدیاں پہلے ہسپانوی فاتحین کے ہاتھوں بسنے والے اس گاؤں میں رہنے کے لیے ذریعہ آمدن ہونا ضروری ہے۔ آمدنی کا یہ ذریعہ مستقل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس دور افتادہ گاؤں میں تو کوئی کاروباری مواقع موجود نہیں ہیں۔ اپنے بڑھے شوہر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی، جیسے ہم دونوں کا مستقل ذریعہ آمدن موجود ہے۔ ہمیں سرکار کی طرف سے پینشن آتی ہے۔ مہربان بزرگ خاتون نے تاراپاکا کے ساتھ اپنی وابستگی کے بارے میں بتایا کہ یہاں زندگی بہت پرسکون ہے۔ میرے سوال کے جواب میں شوخی سے کہنے لگی کہ میں تو جدی پشتی شہری ہوں، میرا یہ محبوب مگر پینیڈو ہے۔ اسی کی محبت میں نصف صدی پیشتر اس نخلستان میں آ کر بس گئی، اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ یہ بتاتے ہوئے بڑھیا نے پیار سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

لق و دق صحرا کے بیچ اس نخلستان میں دو سو کے قریب گھر ہوں گے۔ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیں تو تین سو مکانات یقیناً نہیں ہوں گے۔ چلی کا مجموعی رقبہ پاکستان سے ملتا جلتا ہے۔ جغرافیائی تقسیم اس پٹی نما ملک کی یوں کی گئی ہے کہ اس پٹی کو 13 ریجن یا انتظامی یونٹ بنا کر الگ الگ شناخت دی گئی ہے۔ چلی کا پہلا ریجن اسی ہسپانوی طرز تعمیر کے شاہکار چھوٹے سے گاؤں کی نسبت سے ''تاراپاکا'' کہلاتا ہے۔ سینکڑوں مربع میل رقبے پر پھیلے ملک کے شمال میں واقع اس خطے کی سرحدیں پیرو اور بولیویا کے ساتھ ملتی ہیں۔ ملک کی اہم ترین بندرگاہیں اس خطے میں پائی جاتی ہیں۔ دو بڑے شہر اریکا اور اقیقی اس ریجن میں پائے جاتے ہیں، جن میں پاکستانیوں کی قابل ذکر تعداد موجود ہے، سبھی کاروباری لوگ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''تاراپاکا'' ٹیکس فری زون ہے۔ مرکز سے دوری کے سبب اس علاقے کو خصوصی رعائیت دی گئی ہے۔ ٹیکس فری زون ہونے کے سبب یہاں کثیر تعداد میں غیر ملکی آباد ہیں جو تقریباً سبھی

کاروباری لوگ ہیں۔ پاکستانی زیادہ تر گاڑیوں کے کاروبار سے متعلق ہیں، مسلمان تو یہاں ترک، ایرانی اور عرب بھی ہیں مگر یہ سعادت پاکستانیوں کو نصیب ہوئی کہ انہوں نے یہاں پرشکوہ مساجد تعمیر کی ہیں جو کہ سبھی آباد ہیں۔

بڑے بڑے ملکوں کے بڑے بڑے شہروں کی بڑی بڑی باتیں تو آپ سنتے اور پڑھتے ہی رہتے ہیں۔مگر لاطینی امریکہ کے چلی میں ہسپانوی نوآبادیاتی عہد کا یہ گاؤں آپ کو شاید انٹرنیٹ پر بھی نہیں ملے گا، چونکہ یہ بستی بہت ہی دورافتادہ اور تنہا ہے، تاراپاکا جیسے مقامات دریافت کرنا مجھے بے حد پسند ہے، جہاں تک رسائی مشکل ہو اور کم کم سیاح ہی اس طرف کا رخ کرتے ہوں۔نخلستان میں بسے اس گا ؤں جانے کے لیے مجھے دو چیزوں نے متحرک کیا، ان میں پہلی تو طرز تعمیر اور آثار قدیمہ تھے۔ یہ گاؤں چونکہ سپین سے آئے عیسائی مبلغین اور فاتحین نے بسایا تھا اس لیے قدیم ہسپانوی طرز تعمیر یہاں بے حد نمایاں ہے۔سیلاب زدہ قدیم آثار کے علاوہ کہنہ کلیسا جو کہ عیسائی صوفی بزرگ سینٹ لورانسو کے نام سے منسوب ہے، پوری شان کے ساتھ کئی صدیوں سے ایستادہ ہے۔ دوسری وجہ جس نے اس سفر کی ترغیب دی وہ یہاں کا پانچ صدیاں پرانا قبرستان ہے۔ پرانے کتبے، تعویز قبر اور لوح مزار بہت ساری کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

اس گاؤں کی کوئی خاص معیشت نہیں ہے مگر ہریالی کے سبب کچھ لوگ یہاں مویشی پال لیتے ہیں اور پھر پروان چڑھا کر انہیں فروخت کر کے کچھ منافع کما لیتے ہیں آمدن کا دوسرا ذریعہ عیسائی بزرگ سا ن لورانسو کی درگاہ سے وابستہ چھوٹے، بڑے ٹھیلے، چھابے، ڈھابے ہیں، جو کیتھولک عقیدے کے بزرگ کے کلیسا پر حاضری کے لیے آنے والے زائرین کو روزمرہ کی بنیادی ضروری اشیاء اور سامان خو ردونوش فروخت کرتے ہیں۔ البتہ سالانہ مذہبی تقریبات یا برسی کے موقع پر صورت حال چند دن کے لیے یکسر بدل جاتی ہے۔جنگل میں منگل کا مقولہ یہاں بالکل صادق آتا ہے۔گزشتہ برسوں میں سالانہ میلے کے موقع پر تقریبا ایک لاکھ معتقدین ملک کے طول وعرض سے اس مزار پر حاضری دینے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔گاؤں کے مقامی لوگوں کی چاندی ہو جاتی ہے کہ وہ فائیو سٹار ہوٹل کے نرخوں پر مہمانو ں کو اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں۔ کچھ احباب نے فقط سالانہ میلے کے دنوں کے لیے یہاں مکان

خرید چھوڑے ہیں۔ جو باقی تمام سال خالی رہتے ہیں۔ میلے کے دوران مذہبی مناجات ہوتی ہیں۔ روحانی موسیقی بجائی جاتی ہےاور صوفی رقص پیش کیا جاتا ہے۔

تاراپا کا گاؤں میں داخل ہوتے ہی آثار قدیمہ نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ نیم منہدم مکان، سرائے ،کہنہ بازار ،مگر خوبصورتی یہ ہے کہ اس سارے منظر کا رنگ ، ڈھنگ بالکل ہسپانوی ہے،لگتا ہے میڈرڈ یا قرطبہ کے کسی نواحی گاؤں میں آ نکلے ہیں۔ چلی کے ہزاروں کلو میٹر پر پھیلے شمالی علاقہ جات کا یہ سب سے زرخیز قطعہ اراضی کہلاتا ہے، گرچہ اس کا رقبہ انتہائی مختصر ہے۔ یہاں پہنچ کر پہلا خیال تو یہ آیا کہ آج سے پانچ سو سال پہلے ہسپانوی فوجی یہاں پہنچے کیسے؟ اس وقت تو ہوائی جہاز اور موٹر گاڑیاں نہیں ہو تی تھیں۔ منطقی سی بات لگتی ہے کہ بحری جہازوں سے آئے تھے۔ پھر ذہن میں خیال آیا کہ قریب ترین بندرگاہ بھی یہاں سے سو میل دور ہے۔ بھلا ہسپانوی اس بیابان میں لینے کیا آئے تھے؟ بہت سارے انسانی ارتقاء کے متعلق ایسے سوالات کے جوابات ایسی جگہوں پر جا کر ملتے ہیں۔ یہاں انسانی بستی بسنے کی وجہ تو صحرا میں سبزے کا واحد ٹکڑا ہونا سمجھ میں آجاتا ہے،اس گلستان میں آکر مگر یہ بھی گرہ کھلتی ہے کہ ما ضی میں انسانوں کی زندگی کتنی سادہ اور ضرورتیں کتنی محدود ہوتی تھیں۔ فقط کھانا اور پانی ، یہ دو چیزیں جہا ں میسر آجاتیں تو لوگ خوشی خوشی اس جگہ آباد ہو جایا کرتے تھے۔

گاؤں کے وسط میں گرجا گھر کے اردگرد بہت رونق تھی۔ اس رونق کا سبب سیاح نہیں تھے۔ بلکہ دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے سینٹ لورانسو کے عقیدت مند حضرات و خواتین تھیں۔ چرچ میں لمبی قطاروں میں لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ زیادہ تر ان میں بیمار و نادار لوگ ہی تھے جو اپنی صحتیا بی و شفا پانے کے لیے حاضری بھرنے آئے تھے۔ کلیسا کے باہر لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ یہاں پر بھی لمبی قطا ریں تھیں مگر دھکم پیل بالکل نہیں تھی۔ نیاز میں مچھلی سے تیار کردہ ”سیچے“ تقسیم ہو رہے تھے۔ یہ پیرو کا قومی کھانا بھی ہے۔ کچی مچھلی کو تازہ لیموں کے رس میں لمبا عرصہ بھگونے کے بعد اس میں پیاز کی قاشیں اور دھنیا ڈال کر تیار کیا جاتا ہے۔ سچ پوچھیں تو یہ انتہائی لذیز کھانا ہے۔

قدیم عمارتوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس لیے بھی کہ گھروں کے لکڑی کے دروازے بالکل اسی

ڈیزائن کے ہیں جیسے ہمارے گھروں میں آج بھی چوبی دروازے استعمال ہوتے ہیں ۔ایک اورخو بصورت پہلو جس کا ذکراس گاؤں کے طرز تعمیر کے تذکرے میں ضروری ہے، وہ عمارتوں کے محراب ہیں ۔گھروں کے برآمدوں میں بھی لکڑی کے محراب بنائے گئے ہیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کا ڈیزائن با لکل وہی ہے جو اسلامی آرٹ یا عرب فن تعمیر کا خاصہ ہے۔ یہ قابل فہم بات ہے کہ عربوں نے اسپین پر آٹھ سو سال حکومت کی تھی، جس کا ایک پرتو اور پہلو یہ عمارتی محراب ہیں جو ہسپانیہ اپنے فاتحین جنگجوؤں کے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔گاؤں کے مرکز میں کلیسا کا مینار بھی عرب فن تعمیر کا حصہ لگتا ہے۔اس کلیسا کا ایک حصہ عبادت اور دعائیہ اجتماع کے لیے مخصوص ہے، جبکہ دوسرا حصہ میوزیم محسوس ہوتا ہے۔

سان لورانسو سے منسوب اس انتہائی سادہ اور کشادہ چرچ کے میوزیم میں حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی زندگی کے آخری عشائیے کا منظر پتھر سے بنے مجسموں سے مجسم کیا گیا ہے۔ یسوع مسیحؑ کے مصلوب ہونے سے بیشتر رات، کھانے کی میز پر، اپنے اصحاب کے ساتھ گفتگو کا منظر، تصویری شکل میں تو بارہا اور بہت ساری پینٹنگز میں یقیناً قارئین بھی ملاحظہ فرما چکے ہوں گے، مگر مجسم شکل میں، ان تمام اصحابِ مسیحؑ کے نام کے ساتھ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔جس بزرگ کے نام اور دم قدم سے اس کہنہ گا وَں کی رونق ہے وہ سان لورانسو بھی تبلیغ کی غرض سے اسپین سے ہی آئے تھے۔تاراپا کا گاؤں لاطینی امریکہ میں ہسپانوی نوآبادیاتی عہد کی ایک جیتی جاگتی یادگار تصویر ہے۔

احتجاج کے لاطینی طریقے

احتجاج کرنا کسی بھی ملک کے عوام کا بنیادی انسانی حق ہوتا ہے۔احتجاج کرنے کے طریقے مگر ہر ملک وقوم کے الگ الگ ہیں۔بعض اوقات یہ ملتے جلتے ہوتے ہیں اور اکثر یکسر منفرد نظر آتے ہیں۔حرف شکایت بلند کرنے کا طریقہ تاریخ اور ثقافت سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ایشیاء وافریقہ کے علاوہ مغربی اقوام میں مروجہ احتجاجی طریقوں سے تو ہم بڑی حد تک شناسا ہیں مگر لاطینی امریکہ کے مما لک ہماری نظروں سے عمومی طور پر اوجھل ہی رہتے ہیں۔اس کی وجہ دور افتادہ اور تنہا ہونے کے علاوہ وہاں کی لاطینی زبان سے اخذ کردہ ہسپانوی اور پرتگیزی زبانیں بھی ہیں۔جو کہ ہمارے ملک کی غالب اکثریت کے لئے اجنبی ہیں۔گزشتہ ایک ماہ سے میں لاطینی امریکہ کے سفر پر ہوں اور یہ یہاں احتجاج کا موسم ہے۔ہر تیسرے ملک میں احتجاجی تحریک چل رہی ہے۔کہیں دائیں بازو تو کہیں بائیں بازو کے لوگ احتجاج کر رہے ہیں،کئی جگہ اس نظریاتی تقسیم سے ماورا لوگ اپنے مطالبات کے حق میں نعرہ ء مستانہ بلند کر رہے ہیں۔اس بحث میں جائے بغیر کہ مذکورہ مظاہرے اور مظاہرین کے مطالبے جائز ہیں یا ناجائز، میں نے سوچا کہ آپ کو ان احتجاج کرنے والوں کے طریقۂ احتجاج سے متعارف کروایا جائے۔

سب سے موثر اور فوری متوجہ کرنے والا طریقہ تو باورچی خانے میں استعمال ہونے والے دھات سے بنے ہوئے برتن پیٹنا ہے۔آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر شہر کے کسی بھی چوک میں سو یا دوسو افراد بھی ہاتھوں میں اسٹیل کے چمچ اور فرائی پین یا دیگچی پیٹنا شروع کر دیں تو کس قسم کا ماحول پیدا ہو جاتا ہوگا؟اس کے صوتی اثرات ایسے ہوتے ہیں کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔باورچی خانے

کے خالی دھاتی برتن پیٹنے کا مقصد صرف شور برپا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ یہ پیغام دینا ہوتا ہے کہ گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، یہ بھوک اور پیاس کا استعارہ بن جاتے ہیں، یہ خالی برتن جب مظاہرین انہیں پیٹتے ، بجاتے گلیوں، بازاروں میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔عموماً سال نو مسیحی دنیا میں خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ چراغاں اور آتش بازی کے علاوہ رات کے عین بارہ بجے خوشی کے نعرے گونجتے ہیں۔اس برس کے آغاز پر میں چلی میں تھا، جیسے ہی رات کے بارہ بجے پورے ملک میں لوگوں نے گھریلو برتن پیٹنا شروع کر دیے۔ میرے بہت سارے دوستوں کو یہ آواز بہت ناگوار گزری مگر بہرحال یہ احتجاج کا ایک طریقہ ہے۔

سلو سائیکلنگ کے مقابلے پاکستان میں اکثر کالجز میں ہوتے ہیں۔اس میں مقابلہ سست رفتاری کا ہوتا ہے۔یعنی اس دوڑ کا فاتح وہ ہوتا ہے جو سب سے آہستہ رفتار سے سائیکل چلاتا ہے۔سائیکل سے گرے بغیر اس ریس میں آخر پر پہنچنے والا پہلی پوزیشن پاتا ہے۔اس تفصیل کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ لاطینی امریکہ میں احتجاج کا یہ مقبول طریقہ ہے کہ مظاہرین شہر کی مصروف ترین شاہراہوں کے عین درمیان میں بیس تیس یا اس سے زیادہ کی تعداد میں سائیکل پر سوار ہو کر آ جاتے ہیں، منہ میں ریفری والی سیٹی دبا کر بجاتے جاتے ہیں اور سلو سائیکلنگ کرتے ہیں۔اب بظاہر وہ کوئی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہے ہیں، سڑک پر سائیکل چلانا بھی ان کا حق ہے، مگر رفتار اور انداز ایسا ہے کہ گاڑیوں کی میلوں لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔مکمل ٹریفک جام ہو جاتا ہے اور مظاہرین سائیکلوں پر سیٹی بجاتے چیونٹی جیسی رفتار سے چلتے جاتے ہیں اور اپنا احتجاج نوٹ کرواتے جاتے ہیں۔

ٹائر جلانا اور جلاؤ، گھیراؤ کے دیگر طریقے تو پورے عالم میں یکساں ہیں، لاطینی امریکہ کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں پر احتجاج کا دن پرانے فرنیچر سے نجات حاصل کرنے کا موقع بھی ہوتا ہے۔ضرورت سے زیادہ اور پرانا فرنیچر لوگ گھروں سے لے کر آتے ہیں اور عین چوراہے میں لا کر لکڑی کو آگ دکھا دیتے ہیں۔کئی نٹ کھٹ مظاہرین ٹریفک روک کر تیز میوزک چلا کر رقص شروع کر دیتے ہیں۔ بات یہاں تک ہی ہو تو پھر بھی گوارا ہے ۔نامراد ٹریفک میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بھی

مجبور کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر رقص کریں۔خلاف ورزی کی صورت میں چونکہ گاڑی کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دی جاتی ہے،اس لئے مظاہرین کے ساتھ متاثرین بھی موسیقی کی بلند لے اور تان پر رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کاروباری اداروں، فیکٹری ،کارخانوں اور مل مزدوروں کا احتجاج کا عمومی طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے کارخانے کے مرکزی گیٹ کے سامنے تمام مزدور دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔اگر اپنے مالک کو مزید ذلیل کرنا مقصود ہوتو مزدور آتے جاتے راہگیروں سے چندہ مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔خاموش احتجاج کا عمومی طور پر یہی طریقہ رائج ہے۔چندے سے جمع رقم کا کھانا منگوایا جاتا ہے یا پھر ام الخبائث کا بندوبست ہوتا ہے۔ہمارے ایک پاکستانی دوست جن کی پیرو میں ہمارے شوروم کے قریب ورکشاپ تھی،ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اپنے ملازمین کو تنخواہ دینا گناہ کبیرہ خیال کرتے ہیں۔ایک بار میں نے بھی ان سے کہا کہ آئے دن آپ کے مرکزی گیٹ کے سامنے مزدور، مستری کام بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں، ان کے بار بار احتجاج کے باوجود آپ بروقت تنخواہ کی ادائیگی کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ آپ کے کاروباری حالات بھی برے نہیں ہیں۔لاطینی امریکہ میں مقیم ہمارے اس دوست کا موقف تھا کہ اگر دو، چار مہینے کی تنخواہ دبا کر رکھی جائے تو ملازم کام چھوڑ کر بھاگتا نہیں ہے۔جب تک میں پیرو میں مقیم رہا،ان کے گیٹ کے سامنے اکثر ہی احتجاج کا منظر دیکھا۔ان کے ایک ملازم کا کہنا تھا کہ کتے کے منہ سے ہڈی چھیننا اور آپ کے دوست سے تنخواہ وصول کرنا ایک جیسا مشکل کام ہے۔

وال چاکنگ پوری دنیا میں اپنے مطالبات اور شکایات کے اظہار کے لئے استعمال ہوتی آئی ہے۔پاکستان میں عموماً یہ کام پروفیشنل پینٹرز، برش،سفیدی اور سیاہی کی مدد سے خوش خطی کے ساتھ انجام دیتے ہیں،جس کا وہ محنتانہ وصول کرتے ہیں۔وال چاکنگ میں ایک نئی جہت کا اضافہ ''گریفٹی'' نے کیا ہے۔سپرے پینٹ کی ایجاد سے دنیا بھر میں وسیلۂ روزگار کے طور ہر دیواریں لکھنے والوں کا کام ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔اب کوئی بھی آدمی بازار سے سپرے پینٹ کی سرخ یا سیاہ بوتل لے کر آتا ہے اور اپنی پسند کی دیوار پر اپنی من پسند تحریر لکھ دیتا ہے،کہیں تصویر بنا دیتا ہے۔اس وقت لاطینی

امریکہ کے آپ کسی بھی ملک میں جائیں آپ کو دیواریں ''گریفٹی'' سے اٹی ہوئی ملیں گی۔ کہیں کہیں حیرت بھی ہوتی ہے، ملالہ یوسف زئی کی میکسیکو شہر کی ایک دیوار پر بنی تصویر دیکھی تو پہلی نظر میں آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ کلیسا کی ایک دیوار پر کسی منچلے نے سوالیہ انداز میں سیاسی وسماجی صورتحال کے پیش نظر لکھ دیا تھا کہ اس بارے میں کلیسا کیا کہتا ہے؟ کسی اور نے شرارت سے نیچے لکھ ڈالا کہ اس بارے میں کلیسا خاموش ہے۔

بلیک اینڈ وائٹ پوسٹرز کی ایک قطار کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ ہمارے الیکشن کمیشن سے منظور شدہ سائز کے پوسٹرز پر پیلٹ گن کا شکار مظاہرین کے چہروں کی تصاویر تھیں اور متاثرہ آنکھ کے اوپر سرخ رنگ کا ضرب کا نشان۔ ایک پوسٹر پر صرف ایک شخص کی تصویر، اس کا مکمل نام اور پیشہ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اگر کسی متاثرہ فرد کی دونوں آنکھوں کو پیلٹ گن کی گولی سے نقصان پہنچا تھا تو پھر دونوں آنکھوں پر اس بلیک اینڈ وائٹ اشتہار میں سرخ رنگ کا نمایاں ضرب کا نشان لگایا گیا تھا۔ چلی کے دارلحکومت سنتیاگو کے مرکزی بازار میں پیلٹ گن کا شکار افراد کے چہروں کے نشان زدہ پوسٹروں کی قطار دیکھ کر مجھے مقبوضہ کشمیر کی یاد آ گئی۔ بھارت کے زیرتسلط کشمیر میں ہزاروں کی تعداد میں بے گناہ کشمیری بھارتی فوج کی پیلٹ گنوں کا شکار ہو کر اپنی بینائی جزوی یا پھر مکمل طور پر کھو چکے ہیں۔ میرے خیال میں پاکستانی پارلیمنٹ کی کشمیر کمیٹی اگر کوشش کرے تو پیلٹ گنوں سے متاثرہ افراد کی تصاویر اور کوائف حاصل کر کے اسے پوری دنیا کے سامنے مشتہر کر سکتی ہے۔ یہ چھوٹی سی کاوش ہو سکتا ہے مظلوم کشمیری افراد کا کرب عالمی سطح پر اجاگر کر کے بھارتی فوج کی بربریت بے نقاب کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

چلی میں کرسمس اور نیا سال

عالمی سطح پر عوامی تحریکوں کا ایک بالکل نیا پہلو سامنے آیا ہے، ان احتجاجی تحریکوں کی قیادت کوئی سیاسی جماعت نہیں کر رہی ہے۔ جیسا کہ پڑوسی ملک ہندوستان میں جاری احتجاج ملک کے کونے کونے میں پھیل چکا ہے، جس کی بنیاد غیر ملکی شہریوں کو بھارتی شہریت دینے کا نیا قانون ہے۔ مودی سرکار کے اس نئے قانون کے مطابق اگر آپ مسلمان ہیں تو پھر آپ کو انسانی ہمدردی کے تحت ہندوستان شہریت نہیں دے گا۔ جبکہ بصورت دیگر بھارتی حکومت کی انسانی دوستی بیدار ہوگی اور آپ کو شہریت سے نواز دیا جائے گا۔ گرچہ اس کالے قانون کے خلاف اپوزیشن کی تمام سیاسی جماعتیں بھی سراپا احتجاج ہیں مگر عوامی احتجاج کسی بھی سیاسی پارٹی کے کنٹرول میں نہیں ہے، وہ لوگ بھی احتجاج کا حصہ ہیں جو کسی سیاسی پس منظر اور نظریے کے حامی نہیں ہیں۔ حیرت انگیز طور پر عوامی ردعمل اور احتجاج کا یہی طریقہ اس وقت کئی ممالک میں جاری ہے۔ اس کی ایک مثال لاطینی امریکہ کے ملک چلی سے اٹھنے والی مقبول عوامی احتجاج کی تحریک بھی ہے، جہاں میں اس وقت قیام پذیر ہوں۔

گزشتہ تین ماہ سے جاری اس عوامی احتجاج میں اب تک سو کے قریب افراد ہلاک ہو چکے ہیں، زخمیوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہے جبکہ دس ہزار کے قریب تعداد میں مظاہرین جیل بھیج دیئے گئے ہیں۔ ریل کے کرایوں میں اضافے کے خلاف شروع ہونے والی اس عوامی تحریک کی ابتداء کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ نے کی تھی۔ دارالحکومت سنتیاگو کے زیر زمین بیشتر ریلوے اسٹیشن نذر آتش کر دیے گئے۔ حکومت نے مظاہرین کو دبانے کے لیے پولیس کا استعمال کیا۔ جس سے احتجاج مزید پھیل گیا۔ طلباء کے بعد دیگر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ بیکاری، مہنگائی اور معاشی

تفاوت کے خلاف ملک کے تمام شہروں میں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ان مظاہرین کی تعداد لاکھوں میں پہنچ گئی۔عوامی احتجاجی تحریک کے مطالبات میں کم از کم تنخواہ کی سطح میں اضافہ،صحت اور تعلیم کی بہتر اور سستی سہولیات،پنشن کے نظام میں بہتری کے علاوہ نیا آئین اور صدر مملکت کا استعفیٰ بھی شامل ہے۔موجودہ صدر پنیرا نے ایمر جنسی کا نفاذ کر کے حالات کو قابو کرنے کی کوشش کی ہے۔جگہ جگہ فوج طلب کی گئی ہے اور رات کا کرفیو ملک کے بیشتر شہروں میں نافذ کیا گیا۔کئی وزراء کے قلمدان تبدیل کئے گئے۔وزیر داخلہ اور خزانہ بھی بدل کر دیکھے گئے ہیں۔حالات پر نظر رکھنے والے احباب متفق ہیں اس بات پر کہ سوشلسٹ صدر آیندے کا تختہ الٹنے اور جنرل پنوچے کی فوج کشی کے ہنگام ایسی صورتحال ضرور تھی مگر اس کے بعد کبھی حالات اتنے خراب نہیں ہوئے،جتنے اب ہو گئے ہیں۔دارلحکومت سے لے کر چھوٹے چھوٹے شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔شہروں کا منظر واضح طور پر بدل چکا ہے۔جہاں جہاں شیشے لگے ہوئے تھے۔وہاں وہاں اب دھاتی شیٹ لگادی گئی ہے،یا پھر پلائی ووڈ سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔بقول شخصے پورا شہر جیل کا منظر پیش کر رہا ہے۔

لوٹ مار اور آتشزدگی کے بے شمار واقعات ہوئے ہیں۔اسی تناظر میں جب میں نے حالات سے آگاہی کے لئے اپنی سیکرٹری مارسیلا سوکر سے اس کی رائے جاننے کی کوشش کی، وہ اس قسم کی تحریکوں کے سخت خلاف تھی۔مظاہرین کے متعلق ہماری سیکرٹری کا کہنا ہے کہ یہ سب لوگ ہڈحرامی مارچ کر رہے ہیں۔کام کے بغیر زندگی گزارنے کے خواہشمند حضرات کا یہ مجموعہ ہے جو احتجاج کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔مزید برآں ان سب دنگے،فسادات کے پیچھے کمیونسٹ پارٹی ہے۔دلیل کے طور پر اس نے شہر میں کوکا کولا فیکٹری اور میکڈونلڈ کی جلی ہوئی خستہ عمارتیں دکھائیں جن پر بلوائیوں نے ہلا بولا تھا۔ہماری دوست مارجوری مگر ان خیالات سے متفق نہیں اور وہ اس احتجاجی تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہے۔مارچ کی قیادت کرتے ہوئے باغیانہ پلے کارڈ اٹھائے اس کی تصاویر اخبارات اور ٹیلی ویژن پر موجود ہونے کے سبب اس کے بہی خواہ اسے احتیاط کا مشورہ دے رہے ہیں،بات میں وزن یوں بھی ہے کہ مارجوری کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں کرسمس کی دستک کے ساتھ ہی احتجاج

میں بریک آ گئی کہ چلی کی اکثریتی آبادی کیتھولک عقیدہ عیسائی مذہب کی پیروکار ہے۔دسمبر کی ابتداء کے ساتھ ہی کرسمس کے فلیٹ شہر بھر میں گشت کرنے لگتے ہیں۔سجی سجائی، مذہبی گیت بکھیرتی ان گاڑیوں پرسانتا کلاز کے بھیس میں اور کرسمس کے مخصوص سرخ وسفید رنگ میں ملبوس نوجوان قریہ قریہ،بستی بستی گلیوں ،محلوں میں بچوں کو میٹھی گولیاں اور ٹافیاں تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔مخصوص آہنگ میں لاؤڈ سپیکرز پر خو،خو،خو اور جنگر بیل کی آواز لگاتے جاتے ہیں۔ جہاں کوئی بچہ نظر آئے اس کی طرف ٹافیاں اچھال دیتے ہیں۔

کرسمس گزرنے کے ساتھ ہی احتجاج اور جلاؤ،گھیراؤ نے سر اٹھالیا ہے۔کل شام میں گھر واپس جارہا تھا کہ شہر کی مصروف ترین شاہراہ کے سگنل پر مظاہرین سے مڈبھیڑ ہوگئی، ہوا یوں کہ جیسے ہی ٹریفک کا سگنل بند ہوا چند نقاب پوش لڑکے،لڑکیوں نے پرانے ٹائر اور لکڑی کے کریٹ سڑک پر ایک لائن میں لگا کر ان کو آگ لگا دی ۔اتفاق سے یہ سب میری گاڑی کے سامنے ہورہا تھا۔میں ہمت کر کے باہر نکلا اور اپنی گاڑی کے سامنے پڑے لکڑی کے کریٹ کو ہٹانے لگا،جس میں آتش گیر مادہ تھا۔میں نے مظاہرین سے گزارش کی کہ مجھے گزرنے دو، بعد میں سڑک بند کر لینا۔حیرت اس بات پر ہوئی کہ میری بات مان لی گئی اور احتجاجی لڑکے نے اپنے ہاتھ سے جلتا کریٹ ہٹا کر میری گاڑی گزار دی۔ایک دوست نے اس حُسنِ سلوک کی وجہ میرا غیر ملکی ہونا بیان کیا ہے۔نئے سال کی خوشی میں ہونے والی آتش بازی کے تمام پروگرام منَسوخ کر دیئے گئے جو کہ روایت کا حصہ رہی ہے مگر اس حکومت کا اصل چیلنج شائد مارچ میں آئے گا جب نئے طلباء کے تعلیمی اداروں میں داخلے مکمل ہو جائیں گے۔

لاتیرانا کا عرس

دنیا کے نقشے میں تو لوگ عام طور پر چلی، پیرو اور بولیویا کو ہی مشکل سے ڈھونڈ پاتے ہیں، پھر وہ دورافتادہ شہر جہاں ان ممالک کی سرحدیں ملتی ہیں، بہت ہی کم ہمارے دیسی لوگوں کی نظروں میں آ پاتے ہیں۔ یہ منظر ایک دوردراز قصبے کا ہے۔ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ فضا انتہائی جذباتی ہے۔ کلیسا کا مرکزی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، مغرب کا وقت ہے اور قندیلیں کثیر تعداد میں جگمگا رہی ہیں، زائرین میں اکثریت نوجوانوں کی ہے۔ لڑکیاں زاروقطار رو رہی ہیں اور مناجات میں مشغول ہیں۔ لڑکوں کی اکثریت بھی آبدیدہ نظر آ رہی ہے۔ زیادہ تر حاضرین جوڑیوں کی شکل میں یہاں آتے ہیں۔ سرخ روئی ہوئی آنکھوں اور ان میں نمی کے بغیر ہم جیسے سیاح یہاں کم ہیں، غالب اکثریت مذہبی جوش وجذبے سے نہ صرف پورے چلی کے طول عرض سے یہاں آئی ہے بلکہ جنوبی امریکہ کے ہمسایہ ممالک سے آنے والوں کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے۔ ایک ہزار کی مقامی آبادی والے اس چھوٹے سے قصبے میں، جسے گاؤں کہنا زیادہ مناسب ہے، سال کے ان دنوں میں دو سے تین لاکھ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس قصبے کا نام لاتیرانا ہے، اور جس تہوار کے لئے یہاں لاکھوں لوگ اکٹھے ہوئے ہیں وہ اسی ہستی لاتیرانا سے منسوب عرس یا میلہ ہے۔ عرس کا مطلب چونکہ شادی ہے اور صوفیاء کرام موت کو وصال قرار دیتے ہیں، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کی تفصیل میں جائے بغیر میں یہ لفظ مستعار لے رہا ہوں۔ چونکہ آئندہ آنے والی تفصیل سے بھی آپ کو اس میلے کے لئے عرس کا لفظ ہی مناسب لگے گا۔ مسیحی دنیا اس ہستی کو ''لیڈی آف کارمل'' کے نام سے جانتی ہے۔ مذکورہ معبد اس جگہ قائم ہے جہاں لاتیرانا نے جان دی تھی۔ مرجع خلائق اس گرجا گھر کے گرد ہر سال جولائی کے وسط

میں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہونے والے زائرین کا تذکرہ بعد میں کریں گے، پہلے صاحب مزار کی بات کرتے ہیں۔

یہ کہانی پانچ صدیاں پرانی ہے۔جنوبی امریکہ کے ساحلوں پر جب یورپی بحری جہاز لنگرانداز ہونا شروع ہوئے اور براعظم شمالی وجنوبی امریکہ کو اپنی نوآبادی بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔یہ 1540 عیسوی کا واقعہ ہے جب دنیا کی سب سے قدیم تہذیب ''ان کا'' سے تعلق رکھنے والی ایک جنگجو شہزادی نے یورپی حملہ آوروں اور قابضین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔آٹھ ہزار سال قدیم تہذیب کی وارث اس جارحانہ مزاج شہزادی کا اصل نام تو ذرا مشکل ہے مگر تاریخ میں یہ ''لاتیرانا'' کے نام سے معروف ہوئی۔لاتیرانا کا مطلب آمرانہ مزاج کی حامل ،جابر حکمران، بے رحم غصیلی، تندخو کیا جاسکتا ہے، مگر جابر شہزادی یا ظالم حسینہ حکمران سب سے مناسب ہوگا۔

اساطیری کردار کی حامل یہ ریڈ انڈین شہزادی یورپ کے لوگوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔اپنے لوگوں اور زمین کے تحفظ کے لئے یہ یورپی جارحین کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئی تھی۔اس کی گھڑ سواری اور تیراندازی کی تاریخ میں مثال دی جاتی ہے۔ایسی خطرناک جنگجو کہ جو بھی یورپی یا عیسائی اس کے راستے میں آتا، وہ اسے قتل کردیتی تھی یا پھر اپنا قیدی بنا کر مشقت لیتی تھی۔وہ کوئی عام نازک اندام شہزادی نہ تھی بلکہ ایک فوجی کمانڈر تھی جس کی اپنی ذاتی ملیشیا تھی، ایسی منتقم مزاج کہ چھوٹی سی غلطی بھی کسی کی معاف کرنے کی روادار نہ تھی۔پھر یوں ہوا کہ محبت نے اس کے دل کے دروازے پر دستک دے دی۔وہ پرتگالی لڑکا اس جنگجو شہزادی کا قیدی تھا۔جیسے مثل مشہور ہے کہ ''عشق نہ پچھے ذات''

یہ عشق لاتیرانا کے اپنے ہی نظریات کی مکمل نفی تھا۔ان دنوں یورپی حملہ آور ریڈ انڈین لوگوں کے خون کے پیاسے تھے اور مقامی لوگ یورپی گھس بیٹھیوں کی جان کے درپے تھے۔شہزادی نے پرتگالی نوجوان کی محبت میں اقتدار بھی ٹھکرادیا اور اپنی فوج سے بھی دستبردار ہوگئی۔بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی، اس نے اسی محبت میں عیسائیت قبول کرلی۔بعض مبصرین کا خیال ہے کہ لاتیرانا کے عیسائیت قبول کرنے کی وجہ اپنے عیسائی عقیدہ محبوب سے شادی کے علاوہ موت کے بعد ابدی زندگی میں اس

سے ملن کا تصور تھا۔ قبیلے کے لوگوں اور اس کی رعایا کو اس شادی اور تبدیلی مذہب نے مشتعل کر دیا۔ اسی اشتعال کے نتیجے میں لاتیرانا اور اسکے پرتگالی محبوب کو اپنے ہی لوگوں نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ ان کی قبر پر اٹھارویں صدی میں ایک فنِ تعمیر کا شاہکار کلیسا تعمیر کیا گیا جو اب مرجع خلائق ہے۔ یہ تاریخی معبد جہاں لاتیرانا نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کی تھی، مقامی ثقافت اور کیتھولک روایات کی باہمی آمیزش کا بہترین نمونہ ہے۔ اس معبد کی بھیڑ میں مجھے بولیویا سے تعلق رکھنے والی اپنی گھریلو خادمہ نظر آئی، سرخ روئی ہوئی آنکھوں میں نمی اور ساتھ ایک نوعمر لڑکا تھا، دونوں بڑے خشوع و خضوع سے مناجات میں مشغول تھے۔ یہ مگر شام کا منظر ہے، دن کے وقت رنگ برنگے لباس پہن کر ہزاروں لوگ ٹولیوں کی شکل میں موسیقی کی دھنوں پر رقص کرتے ہوئے شہر بھر کا چکر لگاتے ہیں اور یہ مذہبی رقص مرکزی کلیسا پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ تمام دن یہ جلوس قدم بہ قدم چلتے ہیں۔

لاتیرانا کے میلے پر رقص کرنے کے لئے منتیں مانی جاتی ہیں۔ کسی کی آرزو پوری ہو جائے یا مراد پوری ہونے کی آرزو لے کر ہر عمر کے افراد تمام دن گلیوں میں طبل و علم لے کر رقصاں نظر آتے ہیں۔ اس عمل کو بڑی مذہبی تکریم حاصل ہے، ہماری سیکرٹری مارسیلا اپنی بیٹی کے بارے میں بتا رہی تھی کہ میری بچی بڑی مذہبی اور عبادت گزار ہے، ہر سال لاتیرانا کے عرس پر رقص کرتی ہے۔ ساحل سمندر پر واقع شہر اقیقی سے یہ معبد ستر کلومیٹر ہے، اس شہر میں کوئی دو سو پاکستانی رہتے ہیں اور تقریباً سبھی کاروباری لوگ ہیں چونکہ یہ شہر ٹیکس فری زون ہے۔

اس شہر میں ایک عظیم الشان مسجد موجود ہے جس کی تعمیر کا سہرا پاکستانی مسلمانوں کے سر سجا ہے۔ حالانکہ بڑی دیر سے یہاں عرب اور ترک مسلمان بھی آباد تھے۔ یہ سعادت مگر ہمارے ہم وطنوں کے حصے میں آئی۔ ہمارے ایک دوست نے لاکھوں ڈالر مالیت کا اپنا کارنر پلاٹ مسجد کی تعمیر کے لئے مفت فراہم کر دیا۔ دیگر دوستوں نے بھی دل کھول کر اس کی تعمیر میں حصہ ڈالا اور دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں روپے کی مالیت کا یہ منصوبہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اب یہ شہر کا ایک اہم آئیکون ہے، جسے مؤذنِ رسول کے نام پر مسجد بلال کا نام دیا گیا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ لاتیرانا کے اسی قصبے میں جہاں جنگجو شہزادی نے محبت کی خاطر جان دی، عیسائیت قبول کی اور اب ویٹی کن سٹی میں اسے ''خدا کی ولی،، تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے کلیسا کے کچھ ہی فاصلے پر بھی ایک مسجد اور مسلمانوں کا قبرستان بھی

موجود ہے۔اس کی تعمیر کی سعادت ہمارے دوست اور ہمسائے مبین بھائی کو ملی ہے۔ میں جب بھی اس طرف جاؤں،قبرستان ضرور جاتا ہوں۔ چونکہ وہاں ہمارے ایک عزیز دوست اور ساتھی دفن ہیں، بچپن میں قبرستان جانے سے ڈر لگتا تھا۔مگر پھر کسی نے سمجھایا کہ جب کوئی اپنا قبرستان میں دفن ہوجاتا ہے تو پھر یہ سارا خوف مٹ جاتا ہے۔ایک اپنائیت اور انسیت اس خوف کی جگہ لے لیتی ہے۔لا تیرانا کا یہ مسلم قبرستان بھی بہت اپنا لگتا ہے چونکہ یہاں ہمارے دوست مدفون ہیں۔ایک ایسی خاتون کی بھی قبر ہے جو مطالعہ کے بعد مسلمان ہوئی اور اس خاتون نے وصیت کی تھی کہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔اس کا بیٹا عیسائی ہے مگر اس نے اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کردی، چونکہ اس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔اس خاتون کی قبر پر میں فاتحہ ضرور پڑھتا ہوں۔

ہمبر سٹون

سلطنت برطانیہ کے زیر تسلط رقبہ جب اس قدر وسیع و عریض تھا کہ اس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، نو آبادیاتی عہد کے عروج کے اس دور میں بھی انگریز کبھی براعظم جنوبی امریکہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ شاید سپین اور پرتگال کے ساتھ اس کا یہ خاموش معاہدہ تھا کہ ''ادھر ہم، ادھر تم'' اسی وجہ سے وہ شمالی امریکہ کی طرف اپنی سلطنت کو توسیع دیتا رہا۔ جنوبی امریکہ کے بحرالکاہل کے ساتھ ساحل پر نظر دوڑ ائیں تو نقشے میں چلی کی حدود میں واقع پیرو اور بولیویا کی سرحد کے قریب، ایک شہر کا انگریزی نام پڑھ کر آدمی ٹھٹک جاتا ہے، ''ہمبر سٹون'' خالص انگریزی نام ہے۔ ورنہ پورے براعظم میں شہروں کے ہسپانوی یا پرتگیزی نام ہی سنتے ہیں، یا پھر مقامی قبائلی قدیم ناموں کے ساتھ ساتھ کہیں ولندیزی اور بہت ہوا تو کوئی اطالوی نام نظر آجاتا ہے۔ مگر انگریز اور اس کی زبان انگریزی کا ادھر سے گزر نہیں ہوا۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے اس شہر کو عالمی ورثہ قرار دیا گیا ہے۔ شاید یہ نام کی کشش تھی جو مجھے اس شہر میں لے گئی۔ کہنے کو تو اس شہر کو بھوت نگر یا اجڑا دیار بھی کہا جا سکتا ہے مگر آثار قدیمہ کہتے ہوئے جھجک رہا ہوں کیونکہ یہ جدید طرز کا شہر ہے اور اب پورے شہر کو عظیم الشان میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یوں کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ہمبر سٹون اب کوئی آبادبستی نہیں بلکہ آثار قدیمہ کا بہت بڑا میوزیم ہے۔ اس دیار کا فقط نام ہی انگریزی نہیں، تمام طرز تعمیر بھی برطانوی ہے، اگر کسی نے جنوبی امریکہ میں انگریزی طرز کی جھلک دیکھنا ہو تو اس کے لیے ہمبر سٹون سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس شہر کے بسنے اور اجڑنے کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ یہ کہانی زمین کی زرخیزی کے لیے استعمال ہونے والی کھاد سوڈیم نائیٹریٹ کے ارتقاء سے جڑی ہوئی ہے۔ ہمبر سٹون بنیادی طور پر اس کھاد فیکٹری

کا نام تھا، جو یہاں سوڈیم نائٹریٹ بناتی تھی۔ جسے سائنسی زبان اورعرف عام میں اب بھی چلی کی نسبت سے چلی سالٹ پیٹر کہا جاتا ہے۔اس مقام کا اگر یوں تعارف کروایا جائے تو سمجھنے میں آسانی ہو گی کہ ٹھیک ایک صدی پہلے پوری دنیا میں استعمال ہونے والی زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے کا باعث نا ئیٹریٹ کھاد کا %65 حصہ اس فیکٹری میں تیار کیا جاتا تھا، یہ کوئی مبالغہ نہیں،اعدادوشمار کے علاوہ آثار بتاتے ہیں کہ واقعی 65 فیصد اس فیکٹری میں تیار ہوتا ہوگا۔فصلوں کی پیدوار بڑھانے کے لیے لاطینی امریکہ کے مقامی باشندے طویل عرصے سے سوڈیم نائیٹریٹ کا استعمال کرتے آرہے تھے، یورپ میں اس کی ڈیمانڈ تب بڑھی جب بم بنانے کے لیے، دھماکہ خیز مواد کے طور پر سالٹ پیٹر کا استعمال اورطلب بڑھ گئی۔صدیوں سے ریڈ انڈین جسے زمین کی زرخیزی کا ٹوٹکہ کہہ کر استعمال کرتے آرہے تھے،اسے 1830 عیسوی میں سائنسدانوں نے تجربات کے بعد تسلیم کیا اور مہر تصدیق ثبت کر دی کہ یہ سوڈیم نائیٹریٹ زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے واقعی کارگر ہے، اس سے نائیٹریٹ کی صنعت نے مزید رفتار پکڑ لی۔

اس کھاد فیکٹری کا رہائشی علاقہ قابل دید ہے،ساڑھے تین ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک جدید شہر کا نمونہ تھا۔ٹینس، باسکٹ بال، بیڈمنٹن کے علاوہ وہ فٹ بال کا وسیع وعریض میدان، اتنے سارے کھیلوں کا اہتمام کہ گنوانا مشکل ہے،اسپتال، سینما، تھیٹر، اوپیرا ہال، مختصر یہ کہ ایک جدید شہر میں جو سہولیات آپ سوچ سکتے ہیں وہ تمام یہاں پر مہیا کی گئی تھیں۔جنگل میں منگل کی عملی تصویر نظر آتا ہے یہ علاقہ۔انگریزی طرز تعمیر کے اس رہائشی علاقے میں داخل ہوں تو لگتا ہے جیسے پاک وہند کے کسی قدیم روایتی ریلوے اسٹیشن میں داخل ہورہے ہیں، برصغیر کا ریلوے نظام بھی چونکہ انگریز کا تعمیر کردہ ہے اس لیے مماثلت قابلِ فہم ہے۔ یہاں ہمبرسٹون نامی برطانوی شہری اورسائنسدان کا بھی تذکرہ کرتا چلوں۔جس نے یہ فیکٹری قائم کی پھراس کی دیکھا دیکھی چند اور فیکٹریاں بھی بن گئیں۔مگر پھر بھی اس مقام کو نائیٹریٹ کی پیداوار کے لیے سائنسی بنیادوں پر چننے کا سہرہ اسی کے سر پر بندھتا ہے،جس نے صحراؤں کی خاک چھان کر یہ جگہ تلاش کی تھی اور کھاد فیکٹری اس بیابان میں قائم کی۔

اس کھاد پلانٹ کے قریب ترین بندرگاہ ستر کلومیٹر کی دوری پر اقیقی شہر کی تھی۔ اقیقی کی بندرگاہ اس وقت تک بس مچھلیاں وغیرہ پکڑنے والی کشتیوں تک محدود تھی مگر ہمبرسٹون سے پیدا ہونے والی کھاد کی برآمد کے سبب یہ پورٹ دن دگنی اور رات چگنی ترقی کرنے لگی۔ اس بندرگاہ کا تمام تر انحصار اسی سالٹ پیٹر کی برآمد پر تھا۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ اس وقت یہ کھاد کا پلانٹ اور شہر اقیقی پیرو کا حصہ تھے، چلی اور پیرو کے درمیان ہونے والی جنگ جس کے نتیجے میں یہ شہر اور سینکڑوں میل کا علاقے چلی کے قبضے میں چلا گیا، اس جنگ کے اسباب میں ایک بنیادی محرک مگر یہ اور اس سے ملحقہ کھاد پلانٹ تھے جو ہمبرسٹون میں واقع تھے۔

بحرالکاہل کی جنگ سے تاریخ میں یاد کی جانے والی اس لڑائی میں برطانیہ نے چلی کی حمایت کی تھی اور چلی نے برطانیہ کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ اس کی جنگ میں مدد کرے تو اس فیکٹری کو قومیایا نہیں جائے گا، یہ وعدہ وفا بھی ہوا مگر جنگ کے نتیجے میں بولیویا سمندر سے محروم ہو گیا اور پیرو اپنے سینکڑوں مربع میل رقبے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

عروج کے زمانے میں تشہیر کے لیے بنائے گئے اشتہار دیکھ کر خوشگوار حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب دہلی کے ڈسٹی بیوٹر کی جانب سے جاری کردہ اشتہار میں ایک پنجابی کسان نائیٹریٹ کے استعمال کے سبب کپاس اور مکئی کی بھرپور فصل اٹھا کر مالا مال اور دوسری تصویر میں کسان نائیٹریٹ استعمال نہ کر کے بدحال، پریشان و پشیمان دکھایا گیا ہے۔ چین وعرب سے لے کر ہندوستان اور برازیل تک ملکوں ملکوں چلی کی قدرتی کھاد سوڈیم نائیٹریٹ کے اشتہارات اور ہر زبان میں تعریف، توثیق عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔

زوال کی داستان بھی کمال دلچسپ ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے ہنگام برطانیہ کی خواہش اور ایماء پر جرمنی کو سوڈیم نائیٹریٹ کی برآمد چلی نے بند کر دی، اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو چلی سالٹ پیٹر دھماکہ خیز خصوصیات کے باوصف بم سازی میں استعمال ہوتی تھی، اور دوسری وجہ زمین کی زرخیزی اور فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے یہ کھاد معاون تھی۔ ہر دو صورتوں میں یہ صورتحال انگلستان کے لیے قا

بل قبول نہ تھی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا بحرالکاہل کی جنگ میں پیرو اور بولیویا کے خلاف برطانیہ عظمیٰ نے چلی کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ پلانٹ، شہر بلکہ ہزاروں مربع میل کا علاقہ فتح کرنے میں وہ کامیاب ہوسکا۔ اسی لیے وہ برطانیہ کا پہلی جنگ عظیم میں ساتھی اور حلیف تھا۔ عالمی سچائی پر مبنی ایک مقولہ ہے جو دنیا کی ہر زبان میں الفاظ کے تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ موجود ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

جرمنی کو نائیٹریٹ کی فراہمی پر مکمل پابندی اور بندش کا نتیجہ نئی ایجاد کی صورت میں سامنے آیا، وہ تھی جرمنی کی جانب سے لیبارٹری میں تیار کردہ مصنوعی سوڈیم نائیٹریٹ۔ اس مصنوعی سالٹ پیٹر کی ایجاد نے چلی کے شمالی علاقے میں واقع کھاد کی پیداوار کی اس صنعت کی بربادی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اندازہ لگالیں کہ سن 1910ء میں دنیا بھر میں استعمال کی جانے والی سوڈیم نایٹریٹ کا دوتہائی حصہ اس شہر میں پیدا ہوتا تھا، اگلے بیس برس میں وہ کم ہوکر فقط دس فیصد تک رہ گیا۔ جب سن 1950ء آیا تو پیداوار کا یہ تناسب عالمی پیداوار کا فقط تین فیصد حصہ رہ گیا تھا۔ جیمز تھامس ہمبرسٹون کا بسایا ہوا یہ شہر 1960ء تک مکمل طور پر اُجڑ چکا تھا۔ سلوادور آیندے کی سوشلسٹ حکومت نے اسے 1970 میں قومی ورثہ قرار دے دیا۔ 2005ء میں اس نگر کو عوام الناس اور سیاحوں کے لیے دوبارہ کھولا گیا، اب یہ میوزیم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسی سال اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے اسے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے دیا گیا۔ کھاد فیکٹری کی مینار نما سو میٹر اونچی چمنی سے اب دھواں نہیں اٹھتا۔ مگر سڑک پر سفر کرنے والے مسافروں کو یہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ گزرے ہوئے عہد کا اعلان اور تعارف دور سے ہی یہ آہنی چمنی کروا دیتی ہے۔

آئن سٹائن کی تکریم

آئن سٹائن کی موت سے ہفتہ بھر پہلے کسی شخص نے اس سے سوال کیا تھا کہ بنیاد پرست اندازِ فکر اور سائنسی طرز کی سوچ میں کیا فرق ہے؟ آئن سٹائن کا کہنا تھا کہ بنیاد پرست سوچ کے حامل شخص سے اگر سو سوال کیے جائیں تو وہ سو فیصد کے جواب دے گا، اور اگر سائنسی طرز کی سوچ رکھنے والے آدمی سے آپ سو سوال کریں گے تو وہ ننانوے کے جواب میں معذرت کرے گا کہ مجھے معلوم نہیں ہے جبکہ ایک سوال کا جواب دے گا۔ ایک سوال کا جواب بھی شاید کچھ یوں دے گا کہ اب تک کی معلومات کے مطابق جواب یوں ہے، اگر مزید تحقیق کے نتیجے میں کچھ نیا دریافت ہو چکا ہو یا پھر مستقبل میں ہو جائے تو میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یعنی آئن سٹائن کے بقول سائنسی ذہن والے شخص کے پاس سو میں سے ایک سوال کا جواب بھی حتمی اور قطعی نہیں ہوتا، اس میں بھی مزید امکانات کی گنجائش باقی ہوتی ہے۔

پاکستانی نیوز چینل ٹاک شوز دیکھتے ہوئے کبھی کبھی آئن سٹائن کا یہ جواب میرے ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔ یہاں کسی مخصوص شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد پر تنقید کرنا بے جا ہوگا، کہ ہر سوال کا تسلی بخش جواب نا صرف میزبان کے پاس ہوتا ہے بلکہ ہر مہمان کے پاس بھی ہر موضوع پر حتمی اور اٹل معلومات موجود ہوتی ہیں۔ ہمارے قانونی ماہرین سے آپ معیشت کے بارے میں جو چاہیں، بے دھڑک پوچھ لیں۔ معاشیات کے کسی بھی ماہر سے آپ تعلیمی پروگرام، عالمی تعلقات سے لے کر علم طب کا کوئی سوال کر کے دیکھ لیں، ایسا جواب ملے گا کہ دماغ کے کسی کونے میں کوئی شک باقی نہ رہے گا۔ سیاستدانوں سے تو آپ الجبراء سے لے کر فلکیات کے مسئلے حل کروالیں۔ توانائی کے بحران

اور ٹیکس چوری جیسے معمولی مسائل کا حل تو ایک ٹرانس جینڈر لیڈر کو پیش کرتے میں نے خود ٹیلی ویژن پر دیکھا ہے۔ یہاں سوال یہ ابھرتا ہے کہ اتنے زیادہ ٹیلنٹ کے باوجود ہمارا ملک ترقی کیوں نہیں کر رہا ہے؟ ہم سب کو ہر سوال کا جواب تو معلوم ہے اور ہر مسئلے کا حل بھی ہم چٹکیوں میں بتا سکتے ہیں تو پھر پاکستان آگے کیوں نہیں بڑھ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں معلوم تو کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اداکاری یہ کرتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہے؟ مزید برآں! غلط معلومات رکھنا لاعلم ہونے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

اس مرتبہ آئن سٹائن یاد آنے کی وجہ یہ خبر بنی ہے کہ پاکستانی آئن سٹائن، یعنی ہمارے ایٹمی پروگرام کے بانی وموجد ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہوٹہ لیبارٹری سے فراغت کے بعد سماجی کارکن، پھر کالم نگار بننے کے بعد اب اپنی نئی سیاسی جماعت کو الیکشن کمیشن میں رجسٹرڈ کروالیا ہے۔ اپنی نئی نویلی جماعت کے لیے انہوں نے میزائل کا انتخابی نشان طلب کیا ہے۔ پاکستان کے دستیاب حالات میں اس خبر کو خلافِ توقع تو نہیں کہا جا سکتا، کہ یہی ''ہر فن مولا'' رویہ ہمارا عمومی قومی مزاج بنتا جا رہا ہے۔ اسے المیہ لکھنے کی جسارت نہیں کروں گا کیونکہ پاکستان کے باقی شہریوں کی طرح یہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا بھی بنیادی انسانی حق ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لیں اور اپنی الگ سیاسی حیثیت منوائیں۔ جرمن نژاد امریکی سائنسدان آئن سٹائن کو امریکہ میں بالخصوص اور پورے مغرب میں بالعموم عقل اور ذہانت کا استعارہ مانا جاتا ہے۔ امریکیوں میں تو یہ روزمرہ کا محاورہ ہے کہ اگر کسی مسئلے کو سادہ اور آسان فہم کہنا مقصود ہو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ ''اسے سمجھنے کے لیے کوئی آئن سٹائن کا دماغ نہیں چاہیے۔'' آئن سٹائن کی علمی عظمت کے اعتراف اور مبالغے کو چھوتی ہوئی توقیر کی وجہ ایٹم بم کی ایجاد اور فزکس کے میدان میں اس کے تحقیقی کام کو بیان کیا جاتا ہے۔

میرے ذہن میں آئن سٹائن کے اس اعلیٰ مقام ومرتبے کے پیچھے ایک اور بھی محرک ہے، اور وہ ہے اس کا یہودی مذہب کا پیروکار ہونا، ورنہ دنیا میں اور بھی سائنسدانوں نے نہایت اہم ایجادات اور بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس جملہ معترضہ کی وجہ میرا یہودیوں کے بارے میں

تعصب ہو، جو کہ راسخ ہو چکا ہے۔ چند دیگر وجوہات بھی میری اس سوچ کا سبب ہو سکتی ہیں۔ سخت سردی کے دن تھے جب میں اور میرا کلاس فیلو دوست امتیاز لندن کے مادام تساؤ میوزیم کے مومی مجسمے دیکھنے کے لیے گئے، یہ مجسمے موم سے اس فنکارانہ مہارت سے بنائے گئے ہیں کہ مجسموں کے درمیان کھڑے سیاحوں کو دیکھیں تو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے انسان کون ہے؟ اور مجسمہ کون سا ہے؟ ہندوستان کی تو کئی شخصیات کے مجسمے وہاں موجود تھے لیکن پاکستان کی نمائندگی واحد محترمہ بے نظیر بھٹو کا مجسمہ کر رہا تھا۔ ہم آئن سٹائن کے مجسمے کے قریب سے گزرنے لگے تو ایک ادھیڑ عمر امریکی نے اپنے آٹھ، دس سالہ بیٹے کے ہمراہ ہمیں روک لیا، اور اپنا کیمرہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بڑی لجاجت سے فرمائش کرنے لگا کہ آئن سٹائن کے مجسمے کے ساتھ اس باپ بیٹے کی تصویر بنا دوں۔ میں نے بخوشی تصویر کھینچ دی۔ کیمرہ واپس کرتے ہوئے میں نے اس امریکی سے پوچھا کہ کیا تم یہودی ہو؟ اس نے جواباً صاف گوئی اور تفنّن سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ ایک بٹا چار (1/4) وہ کیسے؟ میرے مزید سوال پوچھنے سے پہلے ہی اس نے اس (1/4) کی وضاحت کر دی کہ اس کی دادی یہودی مذہب کی پیروکار تھی۔ میرا سوال اور امریکی کا دلچسپ جواب سن کر امتیاز تو ہکّا بکّا رہ گیا، مجھ سے فوراً پوچھنے لگا کہ تمھیں کیسے پتا چل گیا کہ یہ آدمی یہودی ہے؟

یوں تو ہالی ووڈ کی فلم انڈسٹری کے زیادہ تر سٹوڈیو مالکان، پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ڈسٹی بیوٹر یہودی ہیں، مگر شاید یہ اتفاق ہی ہو کہ جس فلم میں بھی آئن سٹائن کا ذکر ہو اس کا پروڈیوسر یا پھر ڈائریکٹر ضرور یہودی ہوتا ہے۔ عالمی میڈیا آئن سٹائن کا خوبصورت امیج بنانے میں ایک اہم محرک ہے، مگر عالمی نشریاتی اداروں پر یہودی کنٹرول کے بیان سے میرا مقصد آئن سٹائن یا یہودیت کی مذمت ہرگز نہیں ہے۔ ہر قوم اور قبیلے کو یہ پورا حق ہے کہ وہ اپنے سپوتوں اور سورماؤں پر فخر کرے، ان کا نام بلند کر کے خراجِ تحسین پیش کرے۔

لاطینی امریکہ میں قیام کے دنوں کا ذکر ہے۔ میرا دوست سرخیو راویرو مجھے اپنے ساتھ مرسیڈیز کمپنی کے ڈیلر کے پاس لے گیا، جہاں سے اس نے نئی گاڑی خریدنی تھی۔ کار کے رنگ اور

قیمت کے متعلق اپنے شکوک کا تبادلہ کرنے کے بعد ہم شوروم کے مرکزی دفتر میں چلے گئے۔ دفتر میں جہازی سائز کی آئن سٹائن کی مشہور بلیک اینڈ وائیٹ تصویر لگی ہوئی تھی۔تصویر دیکھتے ہی میں نے سرخیو سے کہا کہ یہ کاف مین (Kaufmann) نامی مرسیڈیز کا ڈیلر یہودی ہے۔ میرے دوست نے حسبِ عادت مجھ سے اختلاف کیا اور بحث شروع کر دی۔ دفتر میں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا اس لیے بحث طوالت اختیار کرگئی۔ جب میں اسے پاگل فوجی اور وہ مجھے متعصب مذہبی کہہ چکا تو ہمارے درمیان اس بات پر شرط لگ گئی کہ مرسیڈیز کمپنی کا مذکورہ ڈیلر یہودی ہے کہ نہیں؟ فیصلہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہم نے شوروم کے مینیجر کو ثالثی کے لیے بلوا لیا تھا۔ سرخیورا ویرو نے پوچھا کہ تمہارا مالک یہودی تو نہیں؟ مینیجر نے جواب دیا ہاں! ہاں! وہ جرمن نژاد یہودی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں اس کے والدین جنوبی امریکہ میں آ کر آباد ہوئے تھے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر کاف مین کے عقیدے سے واقف نہیں تھا مگر میرے اس اندازے کی وجہ آئن سٹائن کی جہازی تصویر کے علاوہ کار ڈیلر کا نام تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں کے نام کے آخر میں MANNِ، SON یا BERG کا لاحقہ آتا ہے وہ معمولی طور پر یہودی ہوتے ہیں جیسے جوناتھ مین، کول مین، روتھ مین یا پھر اینڈرسن، جانسن، سٹیون سن، لاءسن، وغیرہ وغیرہ گولڈ برگ، سپیل برگ، سوڈ برگ بھی اکثر آپ نے ناموں کے آخری حصے کے طور پر سنا ہوگا جسے اہل مغرب فیملی نام یا اسم آخر کہتے ہیں۔ غالب امکان یہی ہے کہ ایسے نام کا حامل فرد یہودی مذہب کا پیروکار ہوگا۔

شرط ہارنے کے باوجود میرا مذکورہ دوست بحث میں شکست تسلیم کرنے کو قطعاً تیار نہیں تھا۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا اب جیسے چلی کی سب سے بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی PULLMANN ہے، مجھ سے ایک اور شرط لگا لو کہ اس کا مالک بھی یقیناً یہودی ہی ہوگا۔ میرے دوست کا اصرار تھا کہ اس ملک میں تو ہر لگژری بس کو ہی PULLMANN کہا جاتا ہے، اس میں سے مالک کا مذہب کیسے برآمد ہوسکتا ہے؟ دراصل جیسے ہمارے ملک میں ائیرکنڈیشن بس

کوڈائیویا کوسٹر کہہ دیتے ہیں۔اسی طرح لگژری بس کے متبادل نام کے طور پر پل مین کا نام مستعمل ہے۔تاہم پہلی شرط ہارنے کی وجہ سے میرے دوست نے دوسری شرط نہیں لگائی اور وقت وحالات کی نزاکت کے پیش نظر بحث کو اگلے مرحلے کے لئے ملتوی کر دیا۔

فرانس کے بعد چلی کی وائن آج کل دنیا میں سب سے زیادہ مقبول سمجھی جاتی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جو یہودی خاندان فرانس میں انگور کے باغات اور''وائینر یا'' کے مالک تھے انہی کے عزیز واقربا نے آ کر چلی کے جنوب میں شراب کشید کرنا شروع کی تھی۔گزشتہ صدی میں ایک وقت ایسا آیا کہ فرانس میں انگوروں کی بیلوں کو ایسی بیماری نے آلیا کہ تمام باغات ہی اجڑ گئے۔صدیوں سے اس کاروبار سے وابستہ ان خاندانوں میں سے یہودیوں نے اپنے چلی میں بسنے والے رشتہ داروں سے رابطہ کیا اور وہاں سے وہ انگور کے پودے،بیلیں درآمد کیں جو کہ کئی برسوں پہلے انہوں نے فرانس کے انہی باغات سے برآمد کی تھیں۔میری ان معلومات کا ماخذ ایک وائن بنانے والی مشہور کمپنی کا مالک ہے۔جو کہ اتفاقاً میرے ساتھ شریک ہوا تھا،جہاز اڑنے سے پہلے اس نے اپنی بیوی کو فون کر کے بتایا کہ میرے برابر والی نشست پر ایک پاکستانی مسلمان سفر کر رہا ہے،اور وہ ہمارے مذہب یہودیت کے بارے میں ہم سے بھی زیادہ معلومات رکھتا ہے۔

انتہائی مہذب اور اپنے خاندان سے بہت قریبی تعلق خاطر رکھنے والا یہ یہودی مشروب ساز وضع داری سے کام لے رہا تھا۔اسی سے مجھے پتہ چلا کہ چلی میں یہودیوں کی کل آبادی بیس سے تیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ عرب دنیا سے باہر فلسطینیوں کی سب سے بڑی آبادی بھی اسی ملک میں ہے،جو کہ پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے،زیادہ تر فلسطینی کاروبار سے وابستہ ہیں۔شاید یہودیوں اور فلسطینیوں کی آبادی کے اسی تناسب کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت نے یہودی مذہب کے خلاف جلوس نکالنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔عربی زبان میں گاڑیوں کے بمپر پر لگا اسٹیکر''فلسطین''آپ کو ملک کے طول وعرض میں اکثر نظر آئے گا۔بے وطنی اور اپنی شناخت کے تحفظ کی یہ کوشش آپ کو ضرور اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔آئن اسٹائن کے جابجا پوسٹر بھی مجھے

دنیا بھر میں بکھرے ہوئے یہودیوں کی اپنی شناخت اورانفرادیت پرفخر کااعلان ہی محسوس ہوتے ہیں۔آخرمیں یہ عرض کرتا چلوں کہ ذاتی طور پر میں آئزک نیوٹن کوآئن سٹائن سے بڑاسائنسدان مانتاہوں،جس نے کشش ثقل اورحرکت کےقوانین کےعلاوہ بےشماردریافتیں ایسی کیں جن کےانسانی تاریخ پرانمٹ نقوش مرتب ہوئے۔ایسی ایجادات نیوٹن کامعرکہ ہیں جن پرآج بھی سائنس فخرمحسوس کرتی ہے۔ستم ظریفی مگر یہ بھی ہے کہ وہ بھی یہودی النسل تھا۔

اک وبا کے عالمی پھیلاؤ کا آنکھوں دیکھا حال

سنتیا گو ائیر پورٹ پر ایک اہلکار نے دوستانہ انداز میں استفسار کیا کہ آپ اس وقت جاپان کیوں جارہے ہیں؟ وہ تو کرونا وائرس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ چلی کے عالمی ہوائی اڈے پر یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کرونا نام سنا، میں نے اس کی بات کو اس لئے درخوراعتنانہ سمجھا چونکہ لاطینی امریکہ کے تمام ممالک میں چپٹی ناک اور نیم باز آنکھوں والے تمام افراد کو ہی ''چینو'' یعنی چائینز کہا جاتا ہے۔ بات کہنے کی حدتک ہو پھر بھی زیادہ فرق نہیں پڑتا، ستم ظریفی یہ ہے کہ چھوٹی موٹی ناک اور نیم باز آنکھیں رکھنے والے تمام ممالک کے افراد کو چینی سمجھا بھی جاتا ہے۔اس لئے جب ائیر پورٹ پر مقامی اہلکار نے دوستانہ وارننگ دی تو میں نے یہی سمجھ کر نظرانداز کر دیا کہ اس بے چارے کو چین اور جاپان کا فرق ہی معلوم نہیں ہے۔ یہ جنوری کا آخری ہفتہ تھا جب میں میکسیکو شہر میں گھوم پھر رہا تھا اور یہاں پر دور دور تک کرونا کا نام ونشان تک نہ تھا، سینما میں فلم دیکھنے کے لئے ہال کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے ۔میکسیکو کی زندگی کا ایک اہم جزا سٹیج ڈرامے بھی ہیں۔شہر کے عین وسط میں ڈراموں کی بھرمار اور کھوے سے کھوا چھلنے کے محاورے کے مصداق لوگوں کی بھیڑ تھی۔ کھانے، پینے کا رواج وہاں ایسے ہی ہے جیسے اندرونِ شہر لاہور اور گردونواح میں، یعنی اوپن ائیر۔ چھوٹے چھوٹے ریستوران بھی ہیں جن میں چٹ پٹے میکسیکن کھانے لائن میں لگ کر لینے پڑتے ہیں۔ دودن اس ست رنگی دل نشین شہر میں گزار کر رخت سفر باندھا، اگلا پڑاؤ ایشیا میں تھا۔

ٹوکیو کے عالمی ہوائی اڈے پر روٹین کی رونق اور بھیڑ تھی۔ حالانکہ کرونا وائرس کا آغاز دسمبر کے وسط میں ہو چکا تھا مگر ابتدا میں تمام دنیا نے اسے چینی مسئلہ خیال کرتے ہوئے دھیان تک نہ

دیا۔امریکہ اور یورپی ممالک نے چین کی مدد کرنے کی بجائے اس وبا سے بچنے کے لئے جن اقدامات کے بارے سوچا وہ یہ تھے کہ ناکہ بندی کردی جائے یا چین سے سامان نہ منگوایا جائے۔ان ابتدائی دنوں میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور برطانوی وزیراعظم تو باقاعدہ اس وبائی مرض کا مذاق اڑاتے ہوئے نظر آئے۔صدر ٹرمپ تو اسے چینی وائرس کا نام دیتے تھے۔جاپان میں فروری کا مہینہ کام،کام اور کام کے فرمان قائد کا عملی نمونہ نظر آیا۔وجہ اس کی یہ تھی کہ اولمپک 2020 کا میزبان ملک ہونے کے ناطے اسے تمام کھیلوں کے مقابلوں کے میدانوں اور انتظامات کو حتمی شکل دینے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔مارچ کے ابتدائی دو ہفتے پوری دنیا کو یہ باور کروانے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئے کہ کرونا وائرس فقط چین کا مسئلہ نہیں ہے۔اس کا پھیلاؤ ہمسایہ ممالک تک پہنچ گیا ہے۔ووہان شہر سے پوری دنیا میں پھیلنے والے اس وائرس کے بارے میں پہلی مرتبہ وزارت خارجہ کے ایک چینی ذمہ دار نے امریکہ پر الزام لگایا تھا کہ اس کی افواج جو چین میں پہنچی تھیں،اس وبا کے پھیلاؤ میں ملوث ہیں۔

چین کے بعد سب سے بری طرح اس وبا سے متاثر ہونے والا ملک ایران تھا۔تہران سے تعلق رکھنے والا میرا دوست علی مرتضٰی گویا بتا رہا تھا کہ اگر دس لوگ ایران میں کرونا وائرس سے ہلاک ہوتے ہیں تو حکومت ایک بتا رہی ہے ۔مارچ کے دوسرے ہفتے میں یہ ایرانی دوست کہہ رہا تھا کہ جانتے،بوجھتے بھی ہماری حکومت اسے نہیں روک پائی چونکہ باقی تمام دنیا نے ہم پر ویسے ہی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ہمارا واحد کھلا راستہ چین کے ساتھ ہے جس پر نارمل کاروبار ہو رہا ہے۔اس لئے ہماری مجبوری تھی کہ کورونا وائرس کی تصدیق کے باوجود اس راستے کو کھلا رکھیں۔کل المیہ یہی نہیں،مرنے والوں کے جنازے اور تدفین میں اہل خانہ کو بھی شرکت کی اجازت نہیں دی جا رہی،غسل میت تک بند کر دیا گیا ہے۔حکومتی اہلکار ہی کفن اور تدفین کرتے ہیں۔

مارچ کے تیسرے ہفتے میں بھی جاپان میں تمام زندگی روٹین کے مطابق چل رہی تھی۔گرچہ یہ مرض یہاں پہنچ چکا تھا اور پھیل بھی رہا تھا مگر حکومت کا رویہ یہ تھا کہ بس احتیاط کریں۔فکر کی کوئی بات نہیں۔اس طرز عمل کی وجہ شائد اولمپک 2020 کا انعقاد بھی تھا۔اسی سبب سے مجھ سمیت تمام آبادی

اس بارے میں کوئی زیادہ متفکرنہیں تھی اور لوگ اسے بیرونی دنیا کے متعلق کوئی وبا سمجھ رہے تھے۔تیسرے ہفتے تک حکومت کا یہ واضح عزم تھا کہ جولائی کے مہینے میں ٹوکیواولمپک 2020 منعقد ہوں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں مارچ کے تیسرے ہفتے تک اس بارے میں بالکل بھی فکرمند نہیں تھا۔ جاہلانہ حدتک لاعلم تھا۔ ذاتی مصروفیات کی وجہ سے اس بارے دھیان ہی نہیں گیا۔ دوسری جانب حکومت کی بھی یہی کوشش تھی کہ ہر چیز کو نارمل ظاہر کرے تاکہ اولمپک مقابلے ملتوی نہ ہوجائیں، چونکہ التواء کی صورت میں پانچ سے چھ ارب ڈالر کا نقصان متوقع تھا۔پہلی بار میں نے اس کروناوائرس کو سنجیدگی کے ساتھ اس وقت لیا۔ جب میں اگلے روز پرواز کے لئے ٹوکیوائیرپورٹ سے ملحقہ ہوٹل میں قیامِ شب کے لیے رُکا۔اس رات جب میں نے انگریزی اخبار کھولا تو بلا مبالغہ کرونا کے علاوہ اس میں کوئی بھی دوسری خبر نہیں تھی۔ ٹی وی پر CNN اور BBC دیکھا تو وہاں پر بھی یہی واحد خبر تھی۔ اگلی صبح ائیرپورٹ پر بنکاک کی پرواز کے لئے جہاز کے زمینی عملے سے بورڈنگ کروائی تو وہاں انتہائی کم لوگ تھے۔امیگریشن کے کاؤنٹر پر عمومی دنوں کی نسبت آدھے لوگ تھے۔تھائی لینڈ جانے کے لئے جس جہاز میں بیٹھا۔اس میں آدھی سے زیادہ نشستیں خالی پڑی تھیں۔ بنکاک ائیرپورٹ پر سراسیمگی کا عالم تھا۔ بزنس لاؤنج صرف ایک کھلا تھا، باقی بند کردیئے گئے تھے۔ائیرپورٹ کی ڈیوٹی فری شاپس کھلی ہوئی تھیں مگر گاہک خال خال ہی نظر آرہے تھے۔، حالانکہ شام چھ، سات بجے کا وقت کام کے اعتبار سے دن کا مصروف ترین وقت ہوتا ہے۔ بنکاک سے لاہور کی فلائیٹ بھری ہوئی تھی مگر بہت سارے چہروں پر ماسک نظر آرہے تھے، اکثریت بشمول میرے ماسک اور دستانوں سے بے نیاز تھی۔لاہور ائیرپورٹ پر تھرمل گن سے ہمارے ماتھے کا درجہ حرارت چیک کیا گیا، گھر پہنچ کر بھی گفتگو کا یہ بنیادی موضوع نہیں تھا۔ ضمنی موضوع تھا۔ شادی ہالوں کی بندش کے سبب خاندان اور دوستوں کے ہاں ہونے والی شادیوں پر واویلا تھا مگر مرض سے خوف کی فضا ہرگز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔اسی بے فکری میں آگے چندروز گزرے۔

کروناوائرس کا چین نے بڑی ہمت، پامردی اور ذہانت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ خدا کا کرنا ہوا کہ

مارچ کے آخری عشرے میں اس مرض نے یورپ میں شدت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اٹلی، سپین سب سے بری طرح اس مرض کے شکنجے میں آ گئے۔ فرانس، انگلستان اور جرمنی سمیت پورا یورپ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ روس میں تادم تحریر اس مرض نے وہ شدت اختیار نہیں کی جس کے سبب بہت سے سازشی نظریات نے بھی جنم لیا ہے۔ کرونا کا ڈرامائی انداز میں نیا مرکز امریکہ بن گیا۔ کسی بھی ملک سے زیادہ وہاں کرونا سے متاثرہ مریض اور اموات کی تعداد سے دنیا نے اس مرض کو زیادہ سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں لاک ڈاؤن ہونا شروع ہو گیا۔ فارمیسی اور کریانہ کے علاوہ تمام دکانیں، تمام فلائیٹس کینسل۔ تمام دنیا فارغ ہو کر گھروں میں بیٹھ گئی ہے۔ یہ مرض اس کرہ ارض پر بسنے والے ساڑھے سات ارب انسانوں کے لئے بالکل نیا اور نا قابل یقین لگتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بنی نوع انسان کو اتنا بے بس نہیں دیکھا۔ دس لاکھ سے زیادہ مریض اور پچاس ہزار افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں مگر تادم تحریر کوئی دوا اس مرض کا علاج نہیں کر سکتی۔ بس احتیاط ہی ہو سکتی ہے، احتیاط کیجئے اور رحمت کی دعا کیجئے۔

پسِ تحریر:

یہ ویکسین کا اثر تھا یا دیگر قدرتی عوامل مگر کرونا کا مرض ایک سال سے زائد عرصہ تک دنیا بھر کو عملی طور پر قیدی اور مفلوج بنائے رکھنے کے بعد پلٹ گیا۔ اس دوران ستر لاکھ لوگ زندگی کی بازی ہار گئے۔ خوف اور وحشت کا ایسا عہد ہم نے زندگی میں نہیں دیکھا اور خواہش کہ بنی نوع انسان کو آئندہ بھی موت کا ایسا رقص نہ دیکھنا پڑے۔ ممکن ہے کہ آج سے سو سال بعد آنے والے لوگ ہمارے عہد کو سائنسی اعتبار سے پسماندہ اور دقیانوسی خیالات و زمانہ جاہلیت سے تعبیر کریں۔ اگلی صدی کے لوگ اس میں حق بجانب بھی ہوں گے کہ کیسے سات ارب آبادی کی دنیا ایک معمولی وائرس کے سامنے بے بس ہو گئی، لاکھوں لوگ موت کے منہ میں چلے گئے، جو بچ گئے وہ بھی قسمت کی خوبی سے بچے ورنہ میڈیکل سائنس کا اس میں کوئی خاص کردار نہیں ہے۔ ایک بات مگر آج سے صدیوں بعد آنے والے شاید نہ جانتے ہوں گے کہ ہم اپنے عہد کو تاریخ انسانی کا جدید ترین عہد سمجھتے تھے۔ ہم سوچا کرتے تھے

کہ سو سال پہلے اور اس سے پیشتر انسان کتنا پسماندہ تھا کہ معمولی بیماریوں کی وجہ سے لاکھوں، کروڑوں لوگ لقمہ اجل بن جایا کرتے تھے۔اس کرہ ارض پر بسنے والے کسی انسان نے کچھ ماہ قبل یہ سوچا بھی نہ تھا کہ تمام دنیا فارغ ہو کر گھروں میں بیٹھ جائے گی ۔ ہر چیز بند ہو جائے گی۔مکمل لاک ڈاؤن ہو گا۔لگتا ہے آنے والے لوگ بھی ہم پر ایسے ہی ہنسیں گے، جیسے گزرے زمانے کے انسانوں کی لاچارگی پر ہم ہنستے تھے۔سچ پوچھیں تو اس کرونا نامی وائرس نے ہمیں یہ احساس تو دلا دیا ہے کہ ہم آج بھی مجبوری کی اسی حالت میں کھڑے ہیں جہاں انسان کم و بیش ایک صدی پہلے کھڑا تھا۔ میری مراد 1920 کے ہسپانوی فلو سے ہے۔جس میں پانچ کروڑ لوگ لقمہ اجل بنے۔جن میں سے پونے دو کروڑ کے قریب ہندوستانی تھے۔سپین کا ذکر آیا ہے تو برسبیل تذکرہ کرونا ہسپانوی زبان ہی کا لفظ ہے جس کے معنی تاج کے ہیں اور اس ''تاجدار وائرس'' نے ہمارا ترقی و علمیت کا سارا غرور خاک میں ملا دیا ہے۔

جاپانیوں کی دیانت داری پر لاطینی تبصرے

کل لاطینی امریکہ کے ایک دور افتادہ ساحل کنارے ریستوران میں جاپانی سماج گفتگو کا موضوع تھا۔ جنوبی امریکہ میں پلے بڑھے میرے ان دوستوں کے لئے جاپان ایک حیرت کدہ تھا۔ کان کنی کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ایک مقامی دوست نے مجھ سے استفسار کیا کہ سنا ہے جاپان میں کھیتوں اور باغات کے کنارے پھل اور سبزیاں رکھ دی جاتی ہیں، ان پر قیمت کا پرچہ آویزاں کیا جاتا ہے، اور پیسوں کے لیے ایک ڈبہ رکھ دیا جاتا ہے۔ لوگ آتے ہیں، پھل، سبزیاں خریدتے ہیں اور قیمت کے پیسے ڈبے میں ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ دوکاندار کوئی بھی نہیں ہوتا مگر لوگ چوری نہیں کرتے اور بددیانتی کا مظاہرہ بھی نظر نہیں آتا، کیا یہ بات سچ ہے؟

میں نے اثبات میں جواب دیا کہ یہ بالکل صحیح منظر کشی ہے اور ماجرا بھی سارا سچ ہے۔ میرا جواب سن کر یہ دوست کہنے لگا کہ یقین کرو اگر یہی پھل، سبزی کا اسٹال یہاں چلی میں کسی کھیت کنارے ہو تو چند منٹوں کے اندر پھل اور پیسوں کا ڈبہ، دونوں غائب ہو جائیں گے۔ بات صرف چلی کی نہیں ایسا منظر جاپان کے علاوہ شاید آپ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں نظر نہ آئے۔ یہ وجہ نہیں کہ باقی دنیا چوروں پر مشتمل ہے، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ من حیث القوم شاید جاپانی باقیوں سے زیادہ دیانتدار ہیں۔ گرچہ جزوی وجہ یہ بھی ہے کہ جاپان میں مزدور کی یومیہ اجرت 20 ہزار روپے سے زائد ہے، اس لئے تھوڑے سے پھل، سبزیاں بیچنے کے لئے کوئی آدمی پوری دیہاڑی نہیں بیٹھنا چاہتا، اس کے باوجود کوئی کسان اپنا اسٹال لگا کر، اس پر پھل، سبزیاں سجا کر قیمت کا اشتہار لگاتا ہے، تو پیسوں کا ڈبہ وہاں رکھ کر جاتے ہوئے اسے یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ جب وہ شام ڈھلے

واپس آئے گا تو پیسوں کا ڈبہ اور بچے ہوئے پھل وہاں پر ضرور موجود ہوں گے۔ یہ یقین بھی ہوگا کہ کوئی مفت بر پھل سبزیاں اٹھا کر نہیں لے گیا ہوگا۔ جاپانی سماج میں چوری کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ روایتی مکانات میں تو گھر کی کنڈی ہی دروازے پر نہیں لگی ہوتی، تالے کے لئے تو جگہ ہی نہیں ہوتی اس لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دلچسپ معاملہ ہے کہ یہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیب ''ان کا'' کی زبان اب بھی بولی جاتی ہے جسے'' کیچوا'' کہتے ہیں۔ پیرو اس آٹھ ہزار سال پرانی تہذیب کا مرکز تھا اور بولیویا کے بھی زیادہ تر حصوں میں یہ زبان ابھی تک رائج ہے۔''کیچوا'' زبان میں سلام کچھ یوں کیا جاتا ہے'' آمایویا، آماکھویا، آماوویا''۔ جس کا اردو زبان میں ترجمہ یوں ہوگا کہ ہم بزدل نہیں، ہم سست الوجود نہیں، اور ہم چور نہیں ہیں۔ مخالفین کا مگر اصرار ہے کہ اس مقامی ''چھولونسل'' جسے عرف عام میں ریڈ انڈین کہا جاتا ہے، اس نسل میں تینوں خرابیاں پائی جاتی ہیں، یہ بزدل بھی ہیں، سست الوجود بھی ہیں اور سب کے سب چور بھی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا اسلام ''تم پر سلامتی ہو'' کے معنی و مطالب رکھتا ہے مگر مخالفین کہتے ہیں کہ ہم دنیا بھر میں لوگوں کے گلے کاٹتے پھرتے ہیں۔ اقوام کے باہمی تعلقات کی تاریخ ان کے ایک دوسرے کے بارے میں تاثرات اور تعصّبات طے کرتی ہے۔ پس جب ایک پاکستانی کی نظر سے لاطینی سماج کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے تمام رنگ ہی خوبصورت لگتے ہیں، قوس قزح کی طرح دلکش، خوبصورت روایات اور انسانیت پرست، محبت کرنے والے لوگ۔ یہ الگ بات کہ دیانتداری کا معیار یہاں زیادہ بلند نہیں ہے۔

جاپانی سماج میں ایمانداری اور دیانت کی وجوہات پر غور کریں تو اس کی وجہ صرف تاریخ، قانون اور ثقافت نہیں بلکہ تربیت بھی ہے۔ بچوں کو شروع سے سکول میں پڑھایا جاتا ہے کہ اگر آپ کو سڑک پر یا پھر کہیں بھی سرِ راہ کوئی قیمتی چیز لاوارث پڑی ملتی ہے تو اسے اٹھا کر جیب میں نہیں ڈال لینا، بلکہ قریب ترین پولیس اسٹیشن میں جمع کروانا ہے۔ جاپان میں مقیم ایک پاکستانی دوست کا بیٹا، جو تیسری جماعت میں پڑھتا ہے، ایک دن مسجد میں مجھے اس بابت اپنے تجربات بتا رہا تھا، ایک دفعہ اس نے پولیس

اسٹیشن جا کر 100 روپے کا سکہ جمع کروایا جو اسے سڑک پر پڑا ملا تھا۔ پھر ایک دن اس کے ہم جماعت اور وہ سکول سے گھر جا رہے تھے کہ انہیں پانچ سو روپے سڑک پر پڑے ملے، تمام ننھے طلباء نے وہ پیسے اٹھا کر قریب ترین پولیس اسٹیشن کا رخ کیا ڈیوٹی پر معمور پولیس اہلکار نے بڑی توجہ سے ان طلباء کی بات سنی، اس واقعے کی مکمل رپورٹ درج کی اور پانچ سو روپے طلباء سے لے کے سرکاری خزانے میں جمع کرنے کے بعد تمام طلباء کا شکریہ ادا کیا، پولیس اسٹیشن کے دروازے پر ان طلباء کو فرشی سلام کر کے تھانیدار نے رخصت کیا۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ 100 یا پھر پانچ سو جاپان میں انتہائی معمولی رقم ہے، اس کے کرنسی نوٹ بھی نہیں ہوتے، فقط سکے ہوتے ہیں، پولیس اہلکار اپنے انہماک اور سنجیدگی سے بچوں کو یہ درس دے رہا تھا کہ وہ ایک بہت اہم کام سرانجام دے رہے ہیں، جو بے حد پسندیدہ بھی ہے۔ یہی بچے ملک وقوم کا مستقبل ہیں۔ شاید یہی بچپن کی تربیت کا اثر ہے کہ دنیا میں گمشدہ سامان اور متاع کے واپس ملنے کی سب سے زیادہ شرح جاپان میں ہے۔

روزمرہ کی ایک بات بتا دوں کہ آپ کا بٹوہ یا پھر پرس کہیں گم ہو گیا ہے تو غالب امکان یہی ہے کہ وہ آپ کو صحیح سلامت واپس مل جائے گا۔ میرے ایک جاننے والے نئے نئے پاکستان سے ہجرت کر کے جاپان آئے تو اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ جاپانی معاشرے کی خامیوں کی نشاندہی کرتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا پرس گم ہو گیا۔ بہت ساری قیمتی اور اہم دستاویزات کے علاوہ قابلِ ذکر مقدار میں نقدی بھی اس بٹوہ میں موجود تھی۔ اب صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، سو وہ اسی کوشش میں تھے کہ غم غلط کیا جائے۔ شام 7 بجے کے قریب گھر کی گھنٹی بجی دروازہ کھولا تو دو پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ پہلے تو مذکورہ ہم وطن پاکستانی گھبرا گیا، مگر جلد ہی ہ گھبراہٹ خوشی میں بدل گئی، جب پولیس اہلکاروں نے بٹوہ نکال کر دکھایا اور پوچھا کہ کیا یہ آپ کا ہے؟ کسی شہری نے تھانے آ کر ہمیں جمع کروایا ہے۔ اپنا گمشدہ بٹوہ جسے دوبارہ پانے کی کوئی امید نہ تھی، پولیس سے وصول کر کے خوشی سے نہال، اپنے ہم مشرب پاکستانی دوستوں سے پوچھنے لگا، کہ یار! کیا یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے؟ ایمان اور کفر کی بحث میں اترے بغیر عرض کرتا چلوں کہ بددیانت شخص کو اہلِ پنجاب بے ایمان کہتے ہیں، اور دیانت دار

شخص پنجاب میں ایماندار کہلاتا ہے۔

ذاتی تجربہ اس ضمن میں یہ رہا کہ ایک شام ریستوران سے کھانا کھا کر نکلتے ہی زمین پر ایک بٹوہ پڑا ملا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، بٹوہ کھولا تو کسی لڑکی کا ڈرائیونگ لائسنس اور کچھ پیسے اس کے اندر نظر آئے۔ ہم پنجاب پولیس کے دہشت زدگان تھانے کے نام سے ذرا گھبراتے ہیں، لہٰذا اردگرد نظر دوڑائی کہ شاید کوئی اور یہ نیکی کمانا چاہے اور تھانے جا کر بٹوہ جمع کروائے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ پولیس سے ایک باعزت فاصلہ رکھتے ہوئے میں واپس ریستوران کے استقبالیے پر پہنچا اور انہیں بٹوہ تھما دیا کہ تمہارے دروازے پر پڑا ملا ہے۔ بیرے نے مجھ سے لیکر بٹوہ کاؤنٹر کے اندر رکھ دیا، کہنے لگا کسی گاہک کا ہوگا، امید ہے کہ ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلے گا۔ بصورت دیگر میں خود پولیس اسٹیشن جا کر جمع کروا دوں گا۔ بات کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ روزمرہ کا یہ کس درجہ معمولی واقعہ ہے۔

جاپان کے ایک دوردراز ساحلی شہر میں بندرگاہ کے قریب ایک بڈھے کو پریشان دیکھا۔ جھنجھلایا ہوا، ادھیڑ بن میں اپنی کشتی کے اردگرد چکر لگا رہا تھا۔ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا، میں نے پوچھا باباجی کیا ماجرا ہے؟ کہنے لگا کچھ سمجھ نہیں آ رہی!! میں نے زور دے کر پوچھا، بزرگوار کیا سمجھ نہیں آ رہی؟

بڈھا کہنے لگا کہ صبح جب میں اپنی بوٹ چھوڑ کر گیا تھا تو یہ بالکل درست تھی۔ ابھی ابھی واپس آیا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اس کا انجن غائب ہے۔ میں نے ادھر ادھر بھی دیکھا ہے کہ کہیں گر نہ گیا ہو، مجھے قریب قریب بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ صبح تو بالکل اسٹارٹ تھا، پھر کدھر چلا گیا؟ غالباً کوئی روسی بحری جہاز کا اہلکار اس کا انجن اتار کر لے گیا تھا، چونکہ قریب ہی روسی بحری جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔ میں نے جاپانی بڈھے کی مشکل آسان کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ باباجی! آپ کی بوٹ کا انجن چوری ہو چکا ہے۔ میری بات سن کر بڈھے نے حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگا ہیں!!! وہ کیسے؟ وجہ اس حیرت کی یہ تھی کہ شاید پوری زندگی میں اس بزرگ کا پہلی بار کسی چور سے واسطہ پڑا تھا۔ اسی لئے اس کو چوری کی واردات کی تفہیم اور رموز سمجھنے میں دشواری کا سامنا تھا۔

سالِ نو کے مناظر

کرسمس کا دن مسیحی دنیا میں خاندان سے متعلق ہوتا ہے۔اہلِ مغرب کے نزدیک کرسمس کا عشائیہ اس تہوار کا سب سے اہم اور بنیادی رکن ہوتا ہے۔ جسے تمام لوگ عموماً اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مناتے ہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہونے کے سبب مذہبی رجحان رکھنے والے خاندان کرسمس کی صبح گرجا گھر جاتے ہیں جہاں خصوصی دعائیہ تقریب ہوتی ہے۔اس دن ولادتِ مسیح کے مختلف پہلوؤں پر پادری اپنے اپنے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔کرسمس اگرچہ اب مذہبی سے زیادہ سماجی تہوار بن گیا ہے مگر پھر بھی اس کا تشخص اور تقدیس اب بھی روحانی نوعیت کی ہے۔ نیو ائیر کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے، اس کا نقش رات کے بارہ بجے، باہر سڑکوں پر گھڑی کی بالائی جانب گھنٹوں اور منٹوں کی سوئیاں اکٹھی ہونے کے انتظار کا ہے۔اس کے ساتھ ہی آتش بازی اور پٹاخے شروع ہو جاتے ہیں، لوگ شہر کے مرکز میں خوشی سے جھومتے اور نعرے لگاتے ہیں، من چلے نئے سال کے نام جام ٹکراتے ہیں۔ان ساعتوں میں عشاق پیمانِ وفا باندھتے ہیں۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کرسمس ان ڈور اور آمدِ سالِ نو کا جشن آؤٹ ڈور تہوار ہیں۔

اب تو جن ملکوں میں عیسائی عقیدہ رکھنے والے لوگوں کی تعداد کل آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہے، وہاں بھی کرسمس ٹری سجے سجائے آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔تمام ہوٹل، شاپنگ مال، دوکانیں، بازار کرسمس کی روشنیوں سے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔لوگوں میں بالکل وہی جوش و جذبہ نظر آتا ہے جو مسیحی اکثریتی آبادی والے ممالک میں نظر آتا ہے۔ روشنیوں اور رنگوں کا ایک دریا سرِ شام بہنا شروع کر دیتا ہے۔ گو کہ چراغاں کی ابتدا نومبر کے آخر میں شروع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ جنوری کے اواخر تک

چلتا ہے، مگراس کا نقطہ عروج کرسمس اور نیوائیر ہی ہے۔ کرسمس ٹری کے ساتھ جا بجا سانتا کلاز کے مجسمے سجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سرخ وسفید لباس میں ملبوس، سفید گالا داڑھی اور عینک والے مہربان بزرگ سانتا کلاز کی سواری کی سج دھج، جس میں بچوں کے لیے تحائف لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تحائف سے بھری کوچ اوراس کو کھینچنے والے بارہ سنگھے کے ماڈل جگہ جگہ رنگ وروشنیوں سے منور نظر آتے ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے سرد ہواؤں کے ساتھ ان دنوں کرسمس اور نئے سال سے منسوب مدھر گیت دوورونزدیک سے سماعتوں سے ٹکراتے ہیں۔ کرسمس ٹری پر سجے لٹکتے آرائشی تحفے، رنگ برنگے ربن میں لپٹے، سرخ اور سبز ڈبوں میں بند اس کرسمس ٹری کے اردگرد بکھرے بہت سے مزیدار تحائف جنہیں بچے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

کرسمس اور سال نو کی لوٹ سیل کے تذکرے کے بغیر تو اس موضوع پر بات نامکمل ہی رہے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے مذہبی نوعیت کے تہوار اور روحانی ایام کو کاروبار کے ساتھ اس طرح منسلک کیا ہے کہ سارا سال لوگ کرسمس سیل کا انتظار کرتے ہیں۔ مشرق بعید خصوصاً جاپان جیسے بدھ مت اکثریتی ملک میں تو کرسمس کے سارے جشن کی بنیادی وجہ ہی کاروباری نوعیت کی ہے۔ اسی کارپوریٹ مفاد کے تحت جاپان میں کرسمس اور نئے سال کی رونقیں مسیحی ممالک کو بھی مات دیتی نظر آتی ہیں۔ ان دنوں کی لوٹ سیل پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے کہ مشرقی یورپ اور روس کے علاوہ آرتھوڈوکس عیسائی مسلک کے لوگ جہاں بھی آباد ہیں وہ کرسمس کا تہوار سات جنوری کو مناتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی اس وقت جو کیلنڈر رائج تھا، اس کے مطابق یہ دن سات جنوری ہی بنتا ہے۔ بنیادی نقطہ یہ ہے کہ آرتھوڈوکس اور کیتھولک عیسائی نئے سال کے ساتویں دن میلاد مسیح مناتے ہیں، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ سمجھتے ہیں کہ یہ نئے سال سے پہلے یعنی 25 دسمبر کا دن ہے جبکہ روسی، یونانی آرتھوڈوکس اسے گریگورین کیلنڈر کے مطابق 7 جنوری کو مناتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ فلسطین کے جس مقام پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی اور اب وہاں کلیسا

قائم ہے، وہاں بھی کرسمس 7 جنوری کو منائی جاتی ہے۔

لاطینی امریکہ میں دیکھا کہ دسمبر کے پہلے ہفتے سے ہی کرسمس کے جلوس نکلنا شروع ہوجاتے ہیں ۔گاڑیوں کے یہ قافلے ریلی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ان میں سانتا کلاز اور کرسمس سے منسوب مختلف کرداروں کے لباس میں ملبوس لوگ گولیاں، ٹافیاں، اور چاکلیٹ بچوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں۔کرسمس اور نئے سال کے گیتوں کی دھنوں پر جھومتے گاتے لوگ راستے میں ملنے والے لوگوں کی جانب ہاتھ ہلاتے جاتے ہیں اور کرسمس کے تحائف تقسیم کرتے جاتے ہیں۔رضا کارانہ طور پر ان جلوسوں میں شامل لوگ اپنی گاڑیوں پر غبارے لگاتے ہیں اور میلا دمسیح مبارک لکھوا کر چلتے ہیں۔جلوس کے راستے میں آنے والے گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بچوں کو سانتا کلاز کے لباس میں ملبوس افراد مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔روزانہ نکلنے والے ان جلوسوں کا نقط عروج 25 دسمبر ہوتا ہے۔

ان دنوں نئے سال کے کیلنڈروں اور ڈائریوں کے تحائف دفاتر میں روز موصول ہوتے ہیں۔ دوست احباب تحائف کا باہمی تبادلہ بھی کرتے ہیں۔محبت کرنے والے ان دنوں نئے سرے سے عہدِ وفا باندھتے ہیں۔کرسمس پر اگر برفباری ہو جائے تو اسے ''وائیٹ کرسمس'' کہتے ہیں۔ برفباری سے اگرچہ سردی میں تو مزید اضافہ ہوجاتا ہے مگر نوجوان منچلے اس سردی اور برفباری کو انجوائے کرتے ہیں ۔کرسمس اور نئے سال کے درمیانی دنوں میں چھٹی جیسا ماحول ہوتا ہے۔اگرچہ سرکاری طور پر غیر مسیحی ممالک میں پچیس دسمبر کی چھٹی نہیں ہوتی اور دفاتر معمول کے مطابق اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔مرزا غالب جن کا یوم پیدائش بھی انہی دنوں، ستائیس دسمبر ہے، جس پر گوگل سرچ انجن نے اس بار 22 ویں سالگرہ پر اپنا صفحہ بطور خراج تحسین غالب کے نام منسوب کیا ہے، کیا خوب اس صورت حال کی ترجمانی اپنے لافانی شعر میں کر گئے ہیں۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

زندگی کا سر چشمہ

تہذیب اور تعلیم کو ترقی کا واحد راستہ خیال کرنے والی ماہر تعلیم اور لازوال لاطینی شاعرہ گبریلا مسترال مجھے بار بار یاد آ رہی ہیں۔ اس کا سبب شائد یہ ہے کہ کتنے ہی برس بیت گئے۔ تین سال پورے ہونے کو آئے ہیں جب جاپان کی تاریخ کا بدترین زلزلہ اور سونامی، ایک ساتھ ناگہانی آفت بن کر آئے۔ زلزلے اور سونامی سے شدید طور پر متاثرہ علاقوں میں ایٹمی پلانٹ بھی اس تباہی کی زد میں آ گئے، اور ان سے تابکاری کا اخراج شروع ہو گیا، اس کا نتیجہ ایٹمی بحران کی صورت میں سامنے آیا جس نے کئی ماہ تک پورے ملک کو بالخصوص اور پورے عالم کو بالعموم خوف کی لپیٹ میں لئے رکھا۔ تیس ہزار سے زائد انسانی جانوں اور اربوں ڈالر کی املاک خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے والے اس حادثے کے اثرات کا اب تک مسلسل جائزہ لیا جا رہا ہے۔ مقامی وزارتِ صحت نے گزشتہ روز اسی بابت ایک رپورٹ پیش کی ہے جس میں 2011ء کے زلزلے، سونامی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ایٹمی بحران کے بچوں کے رویے پر اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس فکر انگیز تحقیقی رپورٹ سے ملک کے سنجیدہ حلقوں میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اس رپورٹ میں پیش کئے گئے سروے کے مطابق آفت زدہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے بچوں میں سے ہر چوتھا بچہ ابنارمل رویے کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ مذکورہ آفت زدگی کے وقت تین سے پانچ سال کی درمیانی عمر کے حامل بچوں پر کئے گئے سروے میں 25.9 فیصد بچے تشدد میں مبتلا، ناخن چبانے یا پھر دوسرے ابنارمل رویوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے پائے گئے ہیں جن کو اب طبی امداد کی ضرورت ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران کئے گئے اس تحقیقی سروے کے مطابق چند سال قبل آنے والی تباہی سے

سب سے زیادہ متاثر ہونے والے علاقوں کے ان نونہالوں کے اس غیر صحت مندانہ رویے کی وجوہات میں آفت زدگی کے دن، دوستوں کو کھودینا اور والدین سے بچھڑ جانا بھی شامل ہیں۔قومی مرکزِ صحت ونگہداشتِ اطفال کے سربراہ، جوکہ اس تحقیقی ٹیم کے ممبر بھی تھے، کا کہنا ہے کہ بچے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔بچوں کے اہلِ خانہ اور ان کے اسکول والوں کو مل جل کر ان کی بحالی کی کوشش کرنی چاہیئے اور ان پر مستقل نظر رکھنی چاہیئے۔

بچپن میں پیش آنے والے حادثات و واقعات انسان کی شخصیت کو کس طرح متاثر کر سکتے ہیں، یہ بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔فرانس کا عہد ساز لیڈر نپولین بوناپارٹ صرف چھ ماہ کا تھا جب ایک جنگلی بلّا آ کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا، ملازم جوکہ قریب ہی کھڑا تھا، اس نے بلّے کو فوراً بھگا دیا۔اس چھوٹے سے واقعے نے بوناپارٹ کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ پر بہت گہرے اور دُور رس اثرات مرتب کیئے۔نپولین ساری زندگی بلیوں سے ڈرتا رہا، حالانکہ وہ تو شیر سے بھی بے دھڑک لڑنے والا آدمی تھا۔19 ویں صدی کے آغاز میں پورے یورپ پر اس کی دہشت طاری تھی، رُوس اس کے خوف سے لرز رہا تھا، مگر انگلستان کے جنرل نیلسن کو نپولین بوناپارٹ کی کمزوری کا پتہ تھا، واٹرلو کی جنگ کے ہنگام میں برطانوی جنرل نے 70 جنگلی بلے اپنے لشکر کے آگے باندھ لئے ۔میدان جنگ کا منظر عجیب تھا کہ آگے جنگلی بلے چل رہے ہیں اور ان کے پیچھے انگریزی فوج مارچ کرتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔اس طرح نپولین بوناپارٹ نے پہلی مرتبہ کسی جنگ میں شکست کھائی۔اپنی زندگی میں واٹرلو سے پہلے وہ ہر معرکہ جیتتا آیا تھا۔گوکہ اس کی شکست کی دیگر وجوہات بھی رہی ہوں گی مگر مورخین نے اس وجہ کو سب سے اہم اور بنیادی قرار دیا ہے۔

پاکستان کئی سال سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔اس خون ریزی کے ہمارے بچوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں، یہ شاید ہمارے کسی بھی فورم پر آج گفتگو کا موضوع نہیں ہے۔تشدد کے ماحول میں پرورش پانے والے یہ بچے جب کل پاکستان کی باگ دوڑ سنبھالیں گے، تو یہ کس قسم کا معاشرہ تشکیل دیں گے، یہ سوچ کر ڈر سا لگتا ہے۔ادب کا نوبل انعام

پانے والی شاعرہ گبریلا مسترال عالمی سطح پر کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں، آج اُن کی تحریر کردہ ایک نظم بہت یاد آ رہی ہے، جس کا میں نے ہسپانوی زبان سے براہ راست اُردو میں ترجمہ کیا ہے، اس کا نام ''آج'' ہے:

ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمہ دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے۔ بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے انتظار کر سکتی ہیں، مگر بچے انتظار نہیں کر سکتے۔ یہی وقت ہے جب ان کی ہڈیاں بن رہی ہوتی ہیں، ان کا خون بن رہا ہوتا ہے اور ان کے حواسِ خمسہ تشکیل پا رہے ہوتے ہیں، ان کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ''کل''۔ کیونکہ اس کا نام ''آج'' ہے۔

چلّی میں چند روز

اس مرتبہ چلّی کا میرا یہ مختصر دورہ ویسے تو نجی و کاروباری نوعیت کا تھا مگر لاطینی امریکہ میں چند برس مقیم رہنے اور ہسپانوی زبان جاننے کے سبب میں اس سماج کے کچھ ایسے پہلوؤں سے بھی واقف ہوں جو عام پاکستانی سیّاح خال خال ہی جان پاتے ہیں اور جو جانتے بھی ہیں وہ انہیں تحریر کرنے کا تردد کم کم ہی کرتے ہیں۔ یہ خطۂ ارض اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ابھی تک پاکستانیوں کی کوئی محبوب منزل نہیں بن سکا ہے۔اس کی بظاہر وجہ دورافتادگی بھی ہے کہ کم از کم پرواز کا دورانیہ بیس گھنٹے اور بعض صورتوں میں تو پاکستان اور جنوبی امریکہ کے درمیان کا فاصلہ طے کرنے کے لیے تیس گھنٹے سے بھی زیادہ عرصہ تک محوِ پرواز رہنا پڑتا ہے۔انہی باتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میں آپ لوگوں کو بھی اس سفر کے کچھ مشاہدات میں شریک کرر ہا ہوں۔میرا ایمان ہے کہ دنیا کا ہر کونا دیکھنے کے قابل ہے اور ہر ملک ایک منفرد جگہ ہے۔

لاطینی امریکہ کا موسم بالکل الٹا ہے کہ جون جولائی سخت سردی کے مہینے ہیں اور دسمبر میں گرمی پڑتی ہے۔چلّی کا ذکر کریں تو اہلِ قلم کے ذہن میں فوراً پابلونرودا کا نام آتا ہے۔اتفاق ایسا ہے کہ مجھے پابلونرودا کے نام اور شاعری کے بارے میں معلومات پہلے ملی تھیں اور چلّی کے وجود کی خبر بہت بعد میں ہوئی تھی اور وہ بھی نرودا کے ہی حوالے سے،اس لیے میرے دل میں یہ بات ہے کہ شاید باقی ہم وطنوں کا بھی یہی معاملہ ہو۔اسی سبب سے میں پابلونرودا کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔جس طرح چلّی کی ریاست اور نرودا لازم وملزوم حوالے بن چکے ہیں تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ لوگوں کے ساتھ اس نوبیل انعام یافتہ مزاحمت کار شاعر، منجھے ہوئے سفارتکار اور اپنے ملک کی صدارت کے لیے منتخب امیدوار کی سنتیا گو

میں واقع رہائش گاہ کے کچھ اندرونی مناظر پر گفتگو کی جائے جو کہ اب ایک مقبول میوزیم اور سیاحتی مرکز بن چکی ہے۔نرودا کے دوسرے شہروں میں واقع دیگر دونوں مکان بھی میوزیم میں تبدیل کیے جا چکے ہیں ۔اس کی قبر بھی ازلا نیگرا والے گھر کے صحن میں اپنی بیوی متلدے کے پہلو میں ہی ہے مگر سنتیا گو والا گھر اس لیے زیادہ اہم ہے کہ نرودا کی عمر کا بیشتر حصہ اسی مکان میں گزرا ہے۔اس رہائش گاہ میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو منفرد اور لکھنے کے قابل ہیں۔

سب سے پہلے تو پہاڑی پر واقع اس رہائش گاہ کا نام ہی بڑا دلچسپ ہے''لا چسکونا'' شاعر کے اپنی بیوی کے بالوں کی نسبت سے گھر کو دیے گئے اس نام کا اردو ترجمہ''زلفِ پریشاں'' مناسب رہے گا۔ دراصل "La Chascona" پرانی ''ان کا'' تہذیب کی زبان ''کیچوا'' کا لفظ ہے اور نرودا اپنی گھنگھریالے بالوں والی تیسری بیوی متلدے کو پیار سے اسی نام سے بلایا کرتا تھا۔

گھر میں رکھے گئے تمام گلاس رنگین ہیں۔کوئی سرخ،کوئی سبز اور نیلے رنگ سمیت تمام رنگوں کے گلاس موجود ہیں مگر کوئی بھی بے رنگ گلاس نہیں ہے۔اس کی وجہ شاعر کی یہ خودساختہ تھیوری تھی کہ گلاس کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔گھر کا ایک حصہ بالکل بحری جہاز کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔وہی فرش اور چھت کا نقشہ اور ویسا ہی دونوں کا درمیانی فاصلہ۔دیواروں اور فرنیچر کی بناوٹ بھی بالکل بحری جہاز جیسی بلکہ ایک لمحہ تو یوں محسوس ہوا جیسے جہاز کے اندر آ گئے ہیں۔اس سے نرودا کی سفر سے رغبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میکسیکو کے عہد ساز مصور اور کیمونسٹ رہنما ڈیگوراویرا کے ہاتھ کی بنائی ہوئی نرودا کی بیوی متلدے کی پینٹنگ بہت سحر انگیز ہے۔اس فن پارے میں متلدے کے ایک ہی جسم پر دو چہرے دکھائے گئے ہیں جن کو اس کی گھنی زلفوں سے ڈھانپا ہوا ہے اور زلفوں کے اندر نرودا کا عکس ہے۔یاد رہے یہ وہی ڈیگوراویرا ہیں جن کے گھر روسی بالشویک انقلاب کے ہیرو ٹراٹسکی نے اسٹالن حکومت کی جانب سے جلاوطن کیے جانے پر اپنی زندگی کے بقیہ ایام گزارے تھے۔اس کے علاوہ دیواروں پر پابلو پکاسو کے ہاتھ کی بنی ہوئی پینٹنگز آویزاں ہیں اور نرودا کی پکاسو کے ساتھ 1950ء کی کچھ تصویریں۔جی ہاں! وہی

معروف مصور پکاسو جس کی بنائی ہوئی تصاویر کی قیمت اب اربوں ڈالر میں ہے۔ پکاسو اور ڈیگو راویرا کے علاوہ بہت سے نوبیل انعام یافتگان یا پھر اسی فنّی سطح کے فنکار پابلو نرودا کے ذاتی دوست تھے جس کا پتہ یہ میوزیم دیکھ کر چلتا ہے۔

رہائش گاہ کے اندر دو میکدے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ نرودا بلا نوش تھا۔ مگر بڑے مہ خانے میں مجھے جس چیز نے متوجہ کیا وہ تین فٹ لمبے جوتوں کا جوڑا اور غیر معمولی طور پر بڑی گھڑی تھی۔ میں نے اپنے تجسس اور حیرت کو جب سوال بنا کر گائیڈ لڑکی آلیخاندرہ سے بیان کیا تو اس نے بتایا کہ گزشتہ صدی میں ہمارے ہاں شرح خواندگی بہت کم تھی اور جو پڑھنا جانتے تھے ان میں سے کوئی مقامی زبان جانتا ہے تو کوئی ہسپانوی اور کوئی دونوں میں سے ایک بھی نہیں جانتا بلکہ ولندیزی پڑھا ہے۔ اسی تناظر میں یہ بڑے جوتے اور گھڑی وغیرہ دکاندار سائن بورڈ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک پورا عہد تھا جس کی نمائندگی بار میں پڑے جوتے اور گھڑی کر رہے ہیں۔

گھر کی لائبریری میں موجود کتابیں اور دیگر سامان تو 1973ء کی فوجی بغاوت کے وقت فوجی اہلکار لوٹ کر لے گئے تھے مگر اب لائبریری کو نرودا کے سفارت کے دور میں زیر استعمال رہنے والی اشیاء سے سجایا گیا ہے۔ اسی فوجی بغاوت کے چند دن بعد مشکوک حالات میں پابلو نرودا کا انتقال ہو گیا تھا جس کو اکثریت ایک قتل قرار دیتی ہے۔ اس کی تفصیل میری حال ہی میں پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کی شاعری کے ہسپانوی سے اردو زبان میں کیے گئے ترجمے کی کتاب ''محبت کے دو رنگ'' میں موجود ہے۔

دورانِ پرواز میری ملاقات ایک ماہر آثار قدیمہ خاتون سے ہوئی، جس کو جب یہ پتا چلا کہ میرا تعلق تاریخی ہڑپہ شہر کے قریبی علاقے میاں چنوں سے ہے تو وہ ہڑپہ کی قربت کی بنیاد پر میرے صدقے واری جانے لگی۔ سندھ کی تہذیب پر سیر حاصل گفتگو کے بعد میں نے اس سے مشورہ طلب کیا کہ سنتیاگو میں سیر کرنے کے لیے کون سی جگہ تجویز کرو گی، تو اس نے کہا کہ پہلے وعدہ کرو مذاق تو نہیں اڑاؤ گے؟ میری یقین دہانی پر کہنے لگی کہ سنتیاگو کا کیتھولک قبرستان جا کر دیکھو۔ مجھے اس مشورے پر ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ اس سے پہلے میں سن چکا تھا کہ ہمارے ایک نئے آنے والے پاکستانی

دوست قبرستان کو پارک سمجھ کر بچوں کو سیر کروانے لے کر گئے تھے۔ بلکہ وہ تو سیر کروا کر بھی آ گئے تھے، گڑ بڑ تو تب ہوئی جب انہوں نے اس پارک کا پتا ایک دوسرے پاکستانی دوست کو بتایا جنھوں نے سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ چلی میں مقیم زیادہ تر پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک ہیں اور ایک خاندان کی طرح ہی رہتے ہیں۔ مجموعی تعداد دو سو افراد کے قریب ہے۔

کیتھولک قبرستان جانا ایک تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ بات ایسی ہے کہ بیان کے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ مشکل ہو رہا ہے۔ وہاں بہت سی قبریں ایسی ہیں جن پر لکھے نام مسلمانوں والے ہیں مگر ان کے کتبوں پر صلیب کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ یہ ماضی میں یہاں آ کر آباد ہونے والے عربوں کی قبریں ہیں۔ ایسی ہی ایک قبر پر یوسف بن عبداللہ لکھا تھا اور صلیب کا نشان بھی بنا ہوا تھا، اس قبر پر میں نے سیاہ سکرٹ میں ملبوس ایک خاتون کو سرخ گلاب کی ایک شاخ رکھتے ہوئے دیکھا۔ یہ سوچ کر بہت تکلیف ہوئی کہ ملک سے باہر رہنے کی قیمت اتنی زیادہ بھی ہو سکتی ہے؟

پاکستان کی طرح یہاں بھی تعلیمی اداروں میں نئے تعلیمی سال کا آغاز عموماً اپریل میں ہی ہوتا ہے۔ فرسٹ ایئر فول ہماری طرح یہاں بھی ہوتے ہیں مگر نئے آنے والے طلباء کے ساتھ ہونے والی ''فولنگ'' دنیا کے باقی ممالک کی نسبت یہاں ایک مختلف اور منفرد معاملہ ہے۔ کالج کے نئے طلباء و طالبات کو برہنہ کر کے شاپنگ بیگ اور رنگین لفافوں کا لباس پہنا کر مرزا غالبؔ کے مصرعے کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا کی عملی تصویر بنا کر شہر کے ہر اہم ٹریفک سگنل پر چندہ اکٹھا کرنے کے لیے ہاتھ میں شاپر پکڑا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جسم کو ڈھانپنے کے لیے مومی لفافوں کے علاوہ مختلف رنگوں کا پینٹ بھی استعمال کیا جاتا ہے اور چہروں پر بھی رنگین نقش نگاری کی جاتی ہے تا کہ نئے طلباء پہچانے نہ جا سکیں اور انہیں اس حلیے میں فنڈ ریزنگ کرتے ہوئے شرم محسوس نہ ہو۔ کل سمندر کے کنارے سڑک پر جاتے ہوئے ہماری گاڑی تک بھی ایسے دو طالب علم پہنچے تھے۔ ساحل سمندر پر غسل آفتابی کرنے والوں کا رش تھا اس لیے ان طلباء کی بے لباسی زیادہ محسوس نہیں ہوئی بلکہ ان کے چہروں پر کی گئی نقاشی نے زیادہ گہرا تاثر چھوڑا۔

11 ستمبر ایک اور بھی ہے

نیویارک کے جڑواں میناروں سے ٹکراتے دو جہاز، عمارتوں سے اٹھتا ہوا دھواں اور آگ کے شعلے وہ پہلا تصور ہیں جو 11 ستمبر کے ذکر کے ساتھ ہمارے ذہن کی سکرین پر نمودار ہوتا ہے۔ 9/11 کو ہی واشنگٹن شہر میں قائم پینٹا گون سے بھی ایک مسافر طیارہ ٹکرایا اور ایک اغوا شدہ جہاز کو اسی دن امریکی فضائیہ نے خود ہی مار گرایا، کیونکہ شک تھا کہ اس مسافر طیارے کو دہشت گردی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ بنیادی اہمیت نیویارک کے ٹوئن ٹاور کو پیش آنے والے حادثے ہی کو حاصل رہی۔ وجہ اس کی شاید یہ تھی کہ انسانی جانوں کا ضیاع سب سے زیادہ اسی حادثے میں ہوا۔ نیویارک کو چونکہ پورے عالم کا دارالحکومت کہا جاتا ہے تو یہ بھی اس کی اہمیت کی بنیاد ہے۔ امن اور انسانیت سے محبت رکھنے والے ہر انسان کو اس سانحے نے افسردہ کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں ''گراؤنڈ زیرو'' گیا، جہاں پر کبھی جڑواں مینار کھڑے تھے، تو میں نے وہاں پر ایک پنجابی نظم اس حوالے سے کہی تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے مذکورہ مقام پر 9/11 کے حادثے کے کوئی ایک سال بعد میرا جانا ہوا تھا، حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کی یادگار تعمیر ہو رہی تھی، وہاں پہنچا تو یہ انکشاف بھی ہوا کہ 9/11 حادثے میں ہلاک ہونے والے زیادہ تر لوگوں کی لاشیں ملبے کے ڈھیر سے نہیں نکالی جا سکی تھیں، لہٰذا یادگار جسے ''9/11 میموریل'' کہا جاتا ہے، ان لاشوں کے اوپر ہی تعمیر ہوئی ہے، اس میموریل کو اجتماعی قبر بھی کہا جا سکتا ہے۔

آج مگر میں آپ سے کسی اور گیارہ ستمبر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے ٹھیک چالیس برس پہلے اس 9/11 آپریشن میں بھی امریکی طیارے استعمال ہوئے تھے۔ امریکی فضائیہ کے پائیلٹ نہ

صرف ایف سولہ طیاروں کو فضائی نگرانی کے لیے استعمال کررہے تھے بلکہ امریکی خفیہ ادارے CIA کے اہلکار باقاعدہ طور پر جنرل پنوچے کی فوج کے شانہ بشانہ، منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اس آپریشن میں حصہ لے رہے تھے۔ جی ہاں! میں گیارہ ستمبر 1973 میں چلی کے عوام کی دو تہائی اکثریت سے منتخب کردہ سوشلسٹ حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کی بات کررہا ہوں۔ سالوادور آیندے کو صدارتی محل میں بمشکل تین سال گزرے تھے جب امریکی معاونت سے چلّی کے جرنیلوں نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ تاریخ کی کتابوں میں بی بی سی لندن کی کھینچی ہوئی وہ تصویر موجود ہے جس میں 9/11 کے روز، اپنی موت سے کچھ لمحے پہلے سالوادور آیندے، ہاتھ میں سٹین گن پکڑے سنتیا گو میں واقع صدارتی محل کی راہداریوں میں گھوم رہا ہے۔ یہ سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان ہونے والی سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا، ان دنوں امریکہ بہادر دائیں بازو کی ہر ملک میں ہونے والی فوجی بغاوت کی بھرپور حمایت کررہا تھا، جمہوریت کے نغمے اور انسانی حقوق کے ترانے بہت بعد میں ریلیز ہونا شروع ہوئے ہیں۔

امریکی 9/11 تو فقط ایک ہی دن کا المیہ تھا مگر اس کی مدد سے جو 9/11 چلّی میں برپا ہوا، وہ ایک طویل المیے کا نقطۂ آغاز تھا۔ سترہ سال تک جنرل پنوچے مطلق العنان حکمران رہا۔ فوجی بغاوت کے چند ہی روز بعد نوبل انعام یافتہ شاعر پابلو نرودا کی مشکوک حالات میں موت واقع ہوگئی، عوام کی غالب اکثریت متفق ہے کہ انہیں قتل کیا گیا۔ اسی پس منظر میں عدالت نے حال ہی میں پابلو نرودا کی قبر کشائی کا حکم دیا تھا اور آج کل طبّی تجزیوں کے بعد میڈیکل رپورٹ کا انتظار کیا جارہا ہے۔ یاد رہے کہ 1969ء میں چلّی کی کمیونسٹ پارٹی نے صدارت کے لیے پابلو نرودا کو نامزد کیا تھا مگر اس خوش نوا شاعر نے اپنے دیرینہ دوست اور کامریڈ آیندے کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کیا، یوں سالوادور آیندے صدر منتخب ہوئے تھے۔

چلی کے جنوبی علاقوں میں رہنے والے دوست بتاتے ہیں کہ جنرل پنوچے کے زمامِ اقتدار سنبھالنے کے کئی مہینے بعد تک، یہ ہر صبح کا معمول تھا کہ ہمیں دریا کی سطح پر انسانی لاشیں تیرتی نظر آتی

تھیں، یہ لاشیں سوشلسٹ خیالات کے حامی سیاسی کارکنوں کی ہوا کرتی تھیں۔ تین ہزار سیاسی کارکن تو ایسے لاپتہ ہوئے کہ ان کی لاشیں بھی آج تک نہیں مل سکیں۔ پروفیسر گلوریا مونیئز، جنہوں نے میری شاعری کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے، اس 9/11 کو یاد کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ ہم سب احتجاج کرنے والوں کو فوجیوں نے گلی، محلوں سے پکڑ دھکڑ کر ٹرکوں میں ڈالا، اور سنتیا گو کے مرکزی اسٹیڈیم میں جمع کر دیا تھا، ہم سب لوگ نعرے لگا رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ اسی دوران معروف عوامی گلوکار وکٹر ہارا بھی گرفتار ہو کر ہمارے ساتھ شامل ہو گیا، کہیں سے گٹار بھی آ گیا، یہاں یہ ذکر ازبس ضروری ہے کہ حالات جیسے بھی نازک، تلخ ہوں، لاطینی امریکہ کے لوگ موسیقی اور رقص کو فراموش نہیں کرتے، پھر کیا تھا کہ وکٹر ہارا نے گٹار تھاما اور انقلابی گیت گانا شروع کر دیے، اس کے نغموں نے تمام اسیروں میں ایک نیا جذبہ جگا دیا۔ مارشل لاء حکام نے جب صورتِ حال بے قابو ہوتے دیکھی تو انہوں نے سب قیدیوں کے سامنے، گٹار بجاتے ہوئے وکٹر ہارا کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔

سنتیا گو کے صدارتی محل کے سامنے واقع بلڈنگ، جہاں سے گیارہ ستمبر کو فائرنگ کی گئی اور بارود کے گولے داغے گئے، اس عمارت پر بارود کے نشان آج بھی صاف نظر آتے ہیں، صدارتی محل کی سیر کروانے والے میزبان نے بتایا کہ جان بوجھ کر اس عمارت پر رنگ وروغن نہیں کیا جاتا، تاکہ یہ داغ سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو ماضی یاد دلاتے رہیں۔ جب تک جنرل پنوچے برسر اقتدار رہا 9/11 کو یومِ نجات منایا جاتا تھا، لیکن اس کی رخصتی کے بعد اسے لوگ یومِ سیاہ کے طور پر مناتے ہیں اور ''ستمگر ستمبر'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

اس گیارہ ستمبر کی یاد یوں آئی کہ چالیسویں برسی سے چند روز پہلے، چلی کی عدلیہ کے نمائندہ ادارے نے عدالت کی جانب سے قوم سے معافی مانگتے ہوئے بیان جاری کیا ہے، کہ جنرل پنوچے کے دور میں اس وقت کے ججوں نے شہریوں کے بنیادی حقوق کا محافظ ہونے کا اپنا فرض اور کردار یکسر ترک کر دیا تھا۔ معذرت خواہانہ بیان میں کہا گیا ہے کہ

''بالخصوص سپریم کورٹ، ریاستی بدسلوکی کے دوران شہریوں کے تحفظ کی ذمہ داری نبھانے

میں ناکام رہی، آمریت کے دوران جن پر مظالم ڈھائے گئے ان کے حقوق کو تحفظ دینے کے لیے عدلیہ کو بہت زیادہ کام کرنا چاہیے تھا۔"

مزید یہ کہا گیا کہ

"اب متاثرین اور معاشرے سے معافی مانگنے کا وقت آ گیا ہے۔ ججوں نے مداخلت کا مطالبہ کرنے والے متاثرین کی حالتِ زار کو رد کر دیا تھا۔"

میری نظر میں عدالت نے معافی مانگ کر اپنی توقیر بڑھائی ہے۔

اگر ہم زیادہ پرانی بات نہ بھی کریں، پرویز مشرف اور ضیاء الحق کے ادوار تو ابھی کل کی بات ہیں، ان آمریتوں میں ہماری عدلیہ نے جو کردار ادا کیا تھا، کیا اسے اپنے اس کردار پر معافی نہیں مانگنی چاہیے؟ میرے خیال میں یہ پاکستانی عوام کا عدالت پر قرض ہے۔

کیا وہ دا قتل کیا گیا؟

آخر وہ خبر آہی گئی جس کا کم از کم مجھے تو انتظار تھا کہ ایک جج نے نوبل انعام یافتہ شاعر، سفارتکار اور سیاستدان پابلو نرودا کی قبر کشائی کا حکم دیا ہے، تاکہ اس عظیم مزاحمت کار کی موت کے اصل اسباب معلوم کیے جا سکیں۔ پابلو نرودا کی وفات مشکوک حالات میں، اس وقت ہوئی، جب جنرل پنوچے نے 1973ء میں منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس فوجی بغاوت سے تین دن پہلے پابلو نرودا کینسر کا مرض تشخیص ہونے کے سبب ہسپتال میں داخل ہوا تھا، جنرل پنوچے کے حکومت پر قبضے کے محض دس روز بعد اس کا اسی ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ سرکاری طور پر اس کی موت کی وجہ دل کا دورہ پڑنا بتائی گئی، مگر چلی میں عام لوگوں کا عمومی خیال ہے کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس تاثر کو اس لیے تقویت ملتی ہے کہ نرودا ہسپتال میں کینسر کی علامات کے سبب داخل کیا گیا، مگر ہلاکت کا سبب دل کا عارضہ؟ غیر منطقی سی بات لگتی ہے۔ حکومت نے اس مسئلے پر 2011ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا تھا۔ سرکاری کمیشن کے سامنے نرودا کے ڈرائیور نے یہ بیانِ حلفی دیا کہ نرودا کو جنرل پنوچے کے اہلکاروں نے زہر دیا تھا، دھوکے سے دیا گیا یہ زہر جان لیوا ثابت ہوا۔ فوج کے زمامِ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد صورتحال یہ تھی کہ ہزاروں لوگوں کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے، موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ چلّی کے جنوبی علاقوں میں رہنے والے دوست بتاتے ہیں کہ فوجی انقلاب کے کئی مہینوں بعد تک، یہ روز کا معمول تھا کہ دریا کے پانی کی سطح پر انہیں لاشوں کی نئی کھیپ ہر صبح تیرتی ہوئی نظر آیا کرتی تھی۔

کولمبیا کے نوبل انعام یافتہ صحافی اور ناول نگار گبریل گارسیا مارکیز کے پابلو نرودا کے متعلق اس بیان سے آج تک دنیا کے کسی بھی معتبر نقاد کو اختلاف کی جرأت نہیں ہوئی کہ ''نرودا بیسویں صدی کا

کسی بھی زبان میں سب سے بڑا شاعر تھا'' مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے پابلونرودا کی شاعری کو اس کے اصل ہسپانوی زبان کے متن سے براہِ راست اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

قبرکشائی کی خبرسن کر مجھے ازلا نیگرا میں واقع پابلونرودا کی گھر کے صحن میں واقع قبر، اور وہاں حاضری کے لیے آئے ہوئے، محبت کرنے والے نوجوان جوڑے یاد آ رہے ہیں۔ ادب کے قارئین تو خوب جانتے ہیں، نئے پڑھنے والوں کو انقلاب اور رومان کے سب سے بڑے شاعر کا تعارف کروا دوں جو 1904ء میں، چلّی کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے قصبے پارال میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر فقط دو ماہ تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے قصبے میں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے دارالحکومت سنتیاگو منتقل ہو گیا۔ وہ صرف دس سال کا تھا جب اس کی پہلی نظم شائع ہوئی، اپنی عمر کے بیس سال مکمل کرنے سے پہلے وہ عالمی سطح پر ایک مقبول شاعر بن چکا تھا۔

نرودا کے والد نے ہمیشہ اس کے لکھنے کے کام کی مخالفت کی اور اسے نصابی کتب پر توجہ دینے کے لیے کہتا رہا، مگر کئی لوگوں نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جن میں گبریلا مسترال بھی شامل تھی۔ سولہ برس کی عمر میں جب اس نے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا تو اس کا ایک مقصد والد کو غچّہ دینا بھی تھا۔ یاد رہے کہ نرودا کا اصل نام نیفتالی باسو آلتو تھا۔ انیس برس کی عمر میں اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا، بیس برس کا تھا جب اس کی نظموں کا عہد ساز مجموعہ ''محبت کی بیس نظمیں'' اشاعت پذیر ہوا، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں اس کی کاپیاں فروخت ہوئیں۔ مگر غربت نے ابھی تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا حالانکہ وہ عالمی سطح پر مانا ہوا شاعر بن چکا تھا۔ معاشی ضرورتوں کی وجہ سے اس نے بحیثیت سفارتکار نوکری اختیار کر لی اور رنگون، کولمبو اور جاوا کے علاوہ سنگاپور میں متعین رہا۔ 1971ء میں جسے نوبل انعام سے نوازا گیا، وہ پابلونرودا چیک ریپبلک کے شاعر جان نرودا سے اتنا متاثر تھا کہ اسی کے نام سے اپنا نام اخذ کیا۔ یورپ کے دورے کے دوران وہ خصوصی طور پر چیکوسلوا کیہ گیا تھا تا کہ اس شاعر کی قبر پر پھول چڑھا سکے۔

ایشیائی ممالک میں سفارتکاری سرانجام دے کر وہ واپس چلی لوٹا تو اسے بیونس آئرس اور پھر

بارسلونا میں سفارتی عہدوں پر تعینات کیا گیا۔ بعدازاں میڈرڈ میں چلی کا قونصلیٹ مقرر ہوا۔ اس کی بیٹی مالوامرینا کی پیدائش میڈرڈ میں ہی ہوئی، یہ بچی اپنی مختصر سی آٹھ سالہ زندگی میں اکثر بیمار ہی رہی۔ اسی دوران سپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہاں اس کا حلقہ احباب زیادہ تر بائیں بازو اور ترقی پسند سوچ کے حامل دانشوروں اور مصنفین پر مشتمل تھا۔ نرودا کے کیمونسٹ خیالات انہی دنوں ترتیب پائے۔ جب سپین کے آمر جنرل فرانکو نے اس کے ادیب دوست گارسیالورکا کو قتل کروا دیا تو اس کے نظریات کیمونزم کے متعلق مزید پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر گئے، وہ کھل کر جنرل فرانکو کے خلاف سوشلسٹوں کی حمایت کرنے لگا جس پر اسے نوکری سے برخواست کر دیا گیا۔ اس کی جرمن بیوی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ 1938ء میں مگر سپین میں اس کے دوست الیکشن جیت کر برسراقتدار آ گئے اور اسے فرانس میں ہسپانوی مہاجرین کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ اس عہدے کے متعلق نرودا کا کہنا تھا کہ ''میری زندگی میں یہ سب سے مقدس مشن تھا جسے میں نے قبول کیا۔'' پھر اس کی زندگی میں ایک اور موڑ آیا اور 1943-1940ء میں وہ میکسیکو میں چلّی کا سفیر تعینات رہا۔ یہاں اس کی دوسری شادی ہوئی اور بدقسمتی سے اپنی بیٹی کی موت کی اطلاع بھی اسے یہیں موصول ہوئی۔ اسی دوران اسٹالن حکومت کے مخالف لیون ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ ہوا جو میکسیکو میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔

نرودا پر الزام ہے کہ وہ اسٹالن حکومت کا حامی تھا اور اس نے ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کو نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ ان کو چلی کے ویزے جاری کر کے ملک سے فرار بھی کروایا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنگِ عظیم دوئم میں نازی جرمنی کی شکست میں اسٹالن کے کردار کی وجہ سے پابلونروداس کا مداح تھا۔ 1953ء میں اسے اسٹالن امن انعام سے نوازا گیا۔ اسٹالن کی موت پر اس نے طویل مرثیہ بھی لکھا مگر ٹراٹسکی پر حملے میں ملوث ہونے کے الزام کی نرودا نے ہمیشہ تردید کی۔ ویزوں کے اجراء کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ ایسا میکسیکو کے صدر کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پابلونرودا کی کردارکشی کے لیے امریکی سی آئی اے نے باقاعدہ ایک خصوصی سیل قائم کیا تھا، یہ کوئی افواہ یا پروپیگنڈا نہیں بلکہ امریکی حکومت اب سرکاری طور پر اس سیل کے

وجود کی تصدیق کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ نرودا پر عائد یہ الزام اور اسی طرح کے دیگر الزامات سی آئی اے کے تراشے ہوئے افسانے ہوں۔ روسی بالشویک انقلاب کے ہیرو ٹراٹسکی کی آپ بیتی، جس کا ہمارے دوست جاوید شاہین کا تحریر کردہ اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اس میں بھی کہیں نرودا کے کسی ایسے فعل میں ملوث ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ یہاں یہ ذاتی نوعیت کا تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ مجھے یہ ترجمہ شدہ کتاب منوّ بھائی نے تحفتاً پیش کی تھی، سبز سیاہی کے ساتھ اپنے دستخط کر کے، جواب بھی میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

1945ء میں وہ سینیٹر منتخب ہوا اور اس کے بعد اس نے کیمونسٹ پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ وہ آنتا فوگاستا سے پہلے سینیٹر منتخب ہوا جس سے اس کی عوامی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ چلّی میں سینیٹر براہِ راست عوامی ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں۔ پاکستان کی طرح بالواسطہ انتخاب کی بجائے سینیٹرز کا انتخاب امریکی طرز پر ہوتا ہے۔ جس میں انتخابی حلقوں کے لوگ بلاواسطہ انہیں منتخب کرتے ہیں۔ اسی سال وہ پیرو گیا جہاں اس نے لازوال نظم ''ماچو پیچو کی بلندیاں'' تحریر کی۔ میسا چیوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ پروفیسر مارٹن کا کہنا ہے کہ یہ نظم ''انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم ہے'' 1946ء میں نرودا کو صدارت کے لیے کیمونسٹ امیدوار کی سیاسی مہم کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ 1948ء میں کیمونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ وہ روپوشی اختیار کر لیتا ہے۔ روپوشی کے دوران وہ تیرہ ماہ تک مختلف شہروں میں اپنے دوستوں کے گھروں اور تہہ خانوں میں چھپتا رہا کیونکہ حکومت کے کارندے اسے گرفتار کرنے کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ ایک سال سے زائد عرصے کی یہ روپوشی یوں ختم ہوئی کہ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر ارجنٹائن فرار ہو گیا۔ یہ سارا واقعہ اس نے نوبل انعام وصول کرتے ہوئے، اپنی نوبل تقریر میں دہرایا تھا۔ اگلے تین سال اس نے جلاوطنی میں گزارے۔ ارجنٹائن میں وہ اپنے ہم شکل، ناول نگار دوست میگل، جسے بعدازاں ادب کا نوبل انعام بھی ملا، اس کے پاسپورٹ پر یورپ اور ایشیا گھومتا رہا۔

جلاوطنی کے دوران جب وہ میکسیکو گیا تو وہاں کی حکومت نے اسے شہریت دے دی۔ وہ اٹلی کے جزیرے کیپری میں اپنے ایک مورخ دوست کے ہاں رہائش پذیر رہا۔ نرودا کا یہ قیام مختصر مگر بہت یادگار رہا۔ اس قیام پر 1965ء میں ایک ناول لکھا گیا اور 1994ء میں اس ناول پر فلم بنائی گئی۔ اطالوی زبان میں بنائی گئی یہ فلم ہمیشہ یاد رکھی جانے والی فلموں میں سے ہے۔ نام ہے ''iL Postino''۔

یہ 1969ء تھا جب پابلو نرودا کو کیمونسٹ پارٹی نے ملک کی صدارت کے انتخاب کے لیے اپنا امیدوار منتخب کیا، مگر وہ اپنے دیرینہ دوست سالوادور آیندے کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ الیکشن ہوئے اور آیندے الیکشن جیت کر چلی کا صدر منتخب ہو گیا۔ اسی کی درخواست پر نرودا فرانس میں سفیر کے عہدے پر فائز ہوا۔ آیندے مگر زیادہ عرصہ صدر کے عہدے پر براجمان نہ رہ سکا۔ امریکی سی آئی اے نے چلی کے فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر اس کا تختہ الٹ دیا، تاکہ کیمونزم کا راستہ روکا جا سکے۔ اس آپریشن میں امریکی F-16 طیاروں اور اس کے فوجیوں نے عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ یہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا اور امریکہ ان دنوں دائیں بازو کے حامی ہر فوجی آمر کا کھل کر ساتھ دے رہا تھا۔ صدر آیندے آپریشن کے دوران مارا گیا اور نرودا اس کے دس دن بعد۔

صدر جنرل پنوچے نے نرودا کے جنازے کو عوامی اجتماع میں تبدیل ہونے پر پابندی لگا دی تھی۔ شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ ملک کے طول و عرض سے ہزاروں افراد نے سنتیاگو کا رخ کیا اور کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شہر کی سڑکوں اور گلیوں کو کھچا کھچ بھر دیا۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ پابلو نرودا کی موت ''آپریشن کونڈور'' کا نتیجہ تھی۔ آپریشن کونڈور سی آئی اے کا ستر کی دہائی میں کیمونزم کے خلاف وہ آپریشن تھا جس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس نے خود اور جنوبی امریکہ میں فوجی آمروں کے ذریعے، دہشت گردی کی کارروائیاں کیں۔ اس دوران بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ساٹھ ہزار سیاسی کارکنوں کو قتل کیا گیا۔ گمشدہ افراد کی تعداد تیس ہزار ہے، جو کبھی واپس گھر نہیں پہنچے جبکہ چار لاکھ افراد پر جنسی تشدد کیا گیا، ہمیشہ کے لیے انہیں معذور بنا دیا گیا۔ اس آپریشن کا

نشانہ بننے والوں کی اوپر دی گئی تعداد وہ ہے جن کے نام، پتے اور تفصیل فائلوں میں موجود ہے۔ پیرا گوئے کے ایک جج نے ایک تھانے پر چھاپے کے دوران حادثاتی طور پر 1992ء میں یہ فائلیں برآمد کی تھیں۔ دنیا بھر میں ان فائلوں کو ''دہشت کی دستاویزات'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ممکن ہے پابلو نرودا کا نام ان فائلوں میں درج ہونے سے رہ گیا ہو؟ فرانزک سائنسدانوں کا یہ کہنا ہے کہ نرودا کی باقیات کے تجزیے سے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوگا کہ اسے کتنا زہر دیا گیا؟ اور کیا یہ زہر موت کا سبب بننے کے لیے کافی تھا؟ موت تو عظیم لوگوں کو بھی آتی ہے، مگر یہ ان کی عظمت میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

پہلی مرتبہ چلی کا نام سن کر کسی ملک سے زیادہ سالم مرچ اور سرد موسم کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ثابت سرخ مرچ کی شکل کا نقشہ اور سرد براعظم انٹارکٹکا کے ڈیڑھ لاکھ مربع میل کے علاقے پر دعویداری کے سبب چلی کے بارے ان ابتدائی خیالات کا آنا بے بنیاد بھی نہیں ہے۔پونے دو کروڑ آبادی والے اس ملک کا رقبہ اس کے باشندگان کے تناسب سے کافی زیادہ ہے۔خوبصورتی کا پہلو یہ ہے کہ تقریباً ہر شہر کو سمندر کا ساحل دستیاب ہے۔آپ کہیں بھی ہوں سمندر آپ سے زیادہ دوری پر نہیں ہوگا۔

اس بار میرے دورے کے آغاز کے ساتھ ہی چلی میں زلزلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ۔سانتیاگو جو کہ دارالخلافہ اور سب سے بڑا شہر ہے اس کے ائیر پورٹ پر اترا ہی تھا کہ زلزلہ آ گیا۔شمال کے اہم تجارتی شہر اقیقے پہنچا تو پھر زلزلے نے آن لیا اور آخری زلزلہ جس کی خبر آپ کے کانوں تک بھی پہنچی ہوگی، 8.36 درجے کا تھا۔ پہلے تو زلزلے کے جھٹکوں کو میں ہنسی میں ٹالتا رہا اور میر انیس کے شعر کے مصداق کہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' اپنی آمد کے اعزاز میں زمین کی جنبش سمجھتا رہا، مگر آخری زلزلہ جس کی شدت سیسمک سکیل پر 8.3 تھی اس نے تو میرا اپنا ''تراہ'' نکال دیا۔

تیس منزلہ عمارت کی چھٹی منزل پر گھر کی دہلیز پکڑ کر ہم اللہ اکبر اور کلمہ کا ورد کر رہے تھے اور ہمارے دائیں بائیں کے ہمسائے گھروں سے نکل کر یسوع مسیح، کنواری مریم اور رحمت والے خدا کا نام لے کر ہاتھ سے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہے تھے۔عورتیں اور بچے چیخ وپکار کر رہے تھے ۔بزرگ، خواتین ہسپانوی زبان میں ''بیٹے، باپ، روح القدس'' کا ذکر اونچی آواز میں کر رہی

تھیں۔عام طور پر زلزلے کا دورانیہ چند سیکنڈ کا ہوتا ہے مگراس کا دورانیہ دومنٹ سے بھی زیادہ تھا۔اس لئے جب میرے کزن علی رضا نے تجویز دی کہ عمارت سے باہر نکل جانا چاہیئے ،تو میں نے بھی اسی میں سلامتی سمجھی۔ایسی صورتحال میں لفٹ استعمال کرنا توخطرناک عمل ہوتا ہے۔اس لئے سیڑھیوں سے چھ فلوراتر کر باہرآ گئے۔سامنے بحرالکاحل کی لہریں ساحل سے ایسے سرپٹخ رہی تھی کہ گونج سے سارے ماحول کو دہشت زدہ کررہی تھیں۔ہم چونکہ قدرے بلندی پر رہائش پذیر ہیں،اس لئے سونامی کی وارننگ کے باوجود ہم محفوظ علاقے میں تھے۔آج شہرمیں کرفیو کی سی کیفیت ہےاورایمرجنسی کااعلان کر کےفوج تعینات کردی گئی ہے۔زلزلے کا مرکزشمال میں ہی سمندر کےاندر 80 کلومیٹرتھا۔

چلی کا شمالی علاقہ تانبے کے ذخائر سے مالامال ہے جس کی بدولت ملک تانبے کی برآمد میں عالمی سطح پر سرِفہرست ہے۔یہاں کی آنتافگاستا کمپنی نے پاکستان میں بلوچستان کے اندر بھی ریکوڈک منصوبے میں بہت بڑی سرمایہ کاری کی تھی مگرسابق چیف جسٹس افتخارمحمد چوہدری کےحکومت کے دیگرشعبوں کے ساتھ ساتھ معیشت کوبھی چلانے کےشوق کے سبب سارامنصوبہ کالعدم قرار پایا۔وہ خودتو گھر بیٹھے پنشن لے کرمزہ کررہے ہیں مگران کےاس فیصلے سے پاکستان اورچلی کے باہمی سفارتی تعلقات کوشدید دھچکا پہنچا۔پاکستان آئندہ ماہ یہاں اپنا سفارت خانہ بندکررہاہے۔جبکہ چلی پہلے ہی اسلام آباد میں اپنا قونصلیٹ بندکر چکاہے۔

سیاسی اعتبار سے چلی دائیں بازواورترقی پسند خیالات کی قوتوں میں بٹا ہوا ہے۔معاشرے میں یہ تقسیم بڑی واضح اور بہت گہری ہے۔انگریز تو صرف نشے کی حالت ہی میں سیاست پر بات کرنا پسند کرتے ہیں مگرلاطینی امریکہ کےلوگ بڑے کھلے ڈھلے مزاج کے ہیں۔ہرموضوع پر بےلاگ تبصرہ پیش کردیتے ہیں۔اہلِ یورپ کا عمومی سیاسی رویہ مگراس کے برعکس ہوتا ہے،کئی سال پہلے صدارتی الیکشن کے دن ہمارے دوست اعجاز گوندل نے پنجابی روایات کے مطابق اپنے فرانس میں مقیم مالک مکان سے پوچھا کہ آج ووٹ کس کوڈالوگے؟فرانسیسی نژادمکان مالک سوال سن کرحیران رہ گیا۔حیرت زدگی کے عالم میں کہنے لگا کہ یہ سوال تو میں اپنی بیوی سے بھی نہیں پوچھ سکتا ہوں۔فرانس

کی سوشلسٹ پارٹی کی طرح یہاں بھی حالیہ الیکشن سوشلسٹ پارٹی نے جیتا ہے۔ گزشتہ ماہ سوشلسٹ رہنما محترمہ مچیل باچیلیت دوسری مرتبہ ملک کی صدر منتخب ہوئی ہیں۔ دائیں بازو کے ایک اخبار نے تو آج صفحہ اول پر بڑا دلچسپ رنگین کارٹون شائع کیا ہے، جس میں محترمہ باچیلیت کو فیدل کاسترو کی فوجی ٹوپی، منہ میں سگار اور گوریلا داڑھی میں مسکراتے دکھایا گیا ہے، مگر کیوبا کے برعکس یہاں کی سرمایہ دارانہ نظام کی حامی سیاسی قوتیں بھی انتہائی طاقتور ہیں۔

محترمہ باچیلیت کے والد 1973ء کی فوجی بغاوت کے وقت ائیرفورس کے بریگیڈئیر تھے اور کمیونسٹ صدر سالوادور آیندے کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے تھے۔ انہیں پورے ملک میں اناج کی تقسیم کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ جب جنرل آگستو پنوچے نے اپنی فوج، امریکی فضائیہ اور سی آئی اے کی مدد سے منتخب صدر آیندے کا تختہ الٹ دیا، تو نومنتخب صدر باچیلیت کے والد کو بھی فوج نے حراست میں لے لیا تھا۔ بائیں بازو کے باقی زیرِ حراست ہزاروں سیاسی کارکنوں کی طرح ان پر بھی روزانہ کی بنیاد پر تشدد کیا جاتا رہا۔ آخر اسی حراست میں بریگیڈئیر باچیلیت کا انتقال ہو گیا، نوبل انعام یافتہ شاعر اور سیاست کار و سفارتکار پابلو نرودا کی موت کا سبب فوجی اہلکاروں نے جیسے دل کا دورہ پڑنا بتایا، بالکل اسی طرح زیرِ حراست صدر باچیلیت کے والد کی موت کو بھی دل کا ناکام ہونا بیان کر دیا۔ جنرل پنوچے کے مظالم کا سلسلہ مگر یہیں ختم نہیں ہوا، محترمہ مچیل باچیلیت اور ان کی والدہ کو بھی زیرِ حراست لے لیا گیا اور تا دیر ان پر تشدد کیا جاتا رہا۔ اس ایذا رسانی کا سلسلہ جلاوطنی پر ختم ہوا۔

تاریخ کے فیصلے بھی مگر عجیب ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر سے تھوڑا دور شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے باہر شاعرِ خوش نوا پابلو نرودا کا قد آدم مجسمہ چمک رہا ہے۔ شہر کے بیچ و بیچ ایک سڑک کے نام پر نظر پڑی تو شاہراہ سالوادور آیندے لکھا دیکھا۔ چند قدم آگے اسی کمیونسٹ رہنما کا مجسمہ اور اس سے منسوب بچوں کا پارک دیکھا۔ باچیلیت مرحوم کی بیٹی ایک مرتبہ پھر الیکشن جیت کر آتی ہے۔ اور حلف برادری سے پہلے سالوادور آیندے کی لکھاری بھتیجی ازابیل آیندے اس کے گلے میں چلی کے پرچم کے رنگوں والا صدارتی ہار ڈالتی نظر آتی ہے۔ حلف اٹھا کر ایک بار پھر وہ

صدارتی محل میں ہے مگر سترہ سال تک مطلق العنان فوجی حکمران جنرل آگستو پنوچے کا آج نام لینے والا بھی کوئی نہیں۔ تاریخ کا ذکر ہو رہا ہے تو اس کی ایک اور ستم ظریفی یہاں قابلِ ذکر ہے۔ چلی کا سوشلسٹ انقلاب وہ پہلا بائیں بازو کا انقلاب تھا جو انتخابات کے ذریعے سے آیا تھا۔ سلوادور آیندے الیکشن میں واضح برتری سے فتح حاصل کر کے صدارتی عہدے پر پہنچے تھے۔ صدر آیندے ایک پکے جمہوریت پسند صدر تھے، روسی خفیہ ادارے KGB نے سویت یونین کے صدر لیونڈ برژنیف کو یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ صدر آیندے جس جمہوری طرز سے حکومت چلا رہے ہیں، اس طرح یہ حکومت قائم نہیں رہ پائے گی، چلی کی فوج کا اقتدار پر قبضہ ناگزیر ہے، اس لیے سوویت یونین کو آیندے کی حکومت بچانے کے لیے اپنے وسائل ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔ گو کہ KGB کی یہ پیش گوئی تو سچ ثابت ہوئی کہ اقتدار پر فوج نے قبضہ کر لیا مگر اندازے کی ایک فاش غلطی ان سے سرزد ہو گئی کہ جمہوری طرز سے ملک چلانے سے شاید سوشلسٹ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آیندے کی سوشلسٹ پارٹی تو آج پھر جمہوری انداز میں الیکشن جیت کر برسر اقتدار آ گئی ہے، مگر برژنیف کا سوویت یونین ٹوٹے ہوئے آج ربع صدی گزر گئی ہے۔ KGB کے اندازے کی یہی غلطی شاید روسی سوشلزم کی ناکامی کا سبب بنی۔ میں نے سنا ہے کہ جنرل ضیاء الحق اور فوجی آمر جنرل پنوچے میں بڑی دوستی تھی، تفصیل پھر کبھی بیان کروں گا۔

ایسا منظر نہیں دیکھا

بحرالکاہل پرواقع خوبصورت ترین ساحلوں میں سے ایک کابانچاہے۔گرمیوں کے موسم میں جنوبی امریکہ کےطول وعرض سے سیاح یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔آج کل یہاں سردیوں کا جوبن ہے۔یعنی ہم سے بالکل الٹ موسم ہے،مگر پھر بھی کثیر تعداد میں لوگ صبح،شام سمندر میں نہانے اور ساحل پر اٹکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ساحل کے ساتھ ساتھ لکڑی سے بنائی گئی پگڈنڈیاں پیدل گشت کرنے کے لئے ایک رومانوی راستہ معلوم ہوتی ہیں۔چلی کے شمال میں واقع یہ ساحل اوراس سے ملحقہ شہر اقیقے تاریخی طور پر پیروکا حصہ تھا۔انیسویں صدی کے آخر میں چلی کے ساتھ پیرواور بولیویا کی ایک تاریخی جنگ ہوئی تھی۔اس جنگ میں چلی نے فتح یاب ہوکر نہ صرف یہ شہر بلکہ تمام شمالی علاقہ اپنے ملک میں شامل کرلیا تھا۔یوں کہہ لیں کہ ملک کا چوتھائی رقبہ اسی جنگ کی فتح کا انعام ہے۔رقبے کے اعتبار سے چلی ہم سے تھوڑا سا کم ہے۔یہ دنیا میں اڑتیسویں نمبر پر ہے جبکہ پاکستان اس کرہ ارض کا چھتیسواں بڑا ملک ہے۔ایک مقامی دوست کا اس بابت کہنا ہے کہ چلی جنوبی امریکہ کا اسرائیل ہے،جس نے ہمسایہ ممالک کا رقبہ اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ شمالی علاقہ اپنی بو،باس اور باشندوں کی شکل وصورت سے چلی سے زیادہ پیرواور بولیویا کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

کل شام ڈھلے میں اسی ساحل کابانچا کے کنارے لکڑی سے بنی پگڈنڈی پر چہل قدمی کررہا تھا کہ مجھے ساحلی سڑک کے اس پار لوگوں کا شور سنائی دیا۔اس کے ساتھ ہی کتے کے مسلسل بھونکنے کی آواز بھی سنی۔شور میں اضافہ اور فضا میں بے چینی بڑھی تو میں متوجہ ہوا۔گھر سے روزہ افطار کرکے

نکلا تھا اور واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی، اسی لئے جب لوگوں کا بڑھتا ہوا رش دیکھا تو گھاس کی ٹکڑیوں اور دورویہ سڑک کو پار کر کے میں دوسرے کنارے جا پہنچا۔ منظر تو کچھ ایسا عجیب نہیں تھا۔ ایک گلٹر یا نسل کے لحیم شحیم کتے نے ایک چھوٹے کتے کو، جیسے آپ روسی پست قامت سفید کتا تصور کر سکتے ہیں، کمر سے دبوچ رکھا ہے اور اسے بھنبھوڑ رہا ہے۔ یقیناً کسی بھی اہلِ دل کے لئے یہ خوشگوار منظر نہیں ہے۔ بلاشبہ دردناک ہے۔ مگر یہاں تو اردگرد قیامتِ صغریٰ برپا تھی۔ میں نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ اس صورتحال میں کیا مدد کی جاسکتی ہے؟ مگر یہاں تو دو درجن سے زیادہ مددگار پہلے ہی جمع ہو چکے ہیں۔ سادہ لباس میں ملبوس سڑک کنارے ریستوران کی نوعمر ویٹرس چلا چلا کر اپنے ساتھی ویٹروں سے کہہ رہی تھی کہ چھوٹے کتے کے بوڑھے مالک کے لئے کرسی لے کر آؤ۔ جلدی کرو۔ بڈھا بہت نروس ہے۔ ارے! کتے کے لئے پانی لیکر آؤ، ایک اور دردمند آواز بلند ہوئی۔

اس دوران میں نے دیکھا کہ گلٹر یا مضبوطی کے ساتھ دانت روسی کتے کی پشت پر گاڑھے ہوئے ہے اور بہت سارے لوگ چھوٹے کتے کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سڑک کے کنارے گاڑیاں کھڑی ہونا شروع ہوگئیں۔ لوگ گاڑیوں سے نکل کر اس پوڈل کتے کی مدد کرنیکی کوشش میں، اس کے مالک کی پریشانی بیان سے باہر ہے۔ اسی اثناء میں کولمبیا سے تعلق رکھنے والا ایک لڑکا آگے بڑھا اور اس موٹے گلٹر یا کتے کو زور زور سے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے، یہ فارمولا کارگر ثابت ہوا اور گلٹر یا نے چھوٹے کتے کو چھوڑ کر گھر کی راہ لی۔ مگر معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ میں نے بھی سوچا کہ میں آخری تماشائی تک یہ منظر دیکھوں گا۔ چھوٹا کتا چھوٹ تو گیا مگر زخمی ہو گیا تھا۔ سفید کھال پر خون کا سرخ رنگ واضح بتا رہا تھا۔ ویٹرس لڑکی چلائی کہ کوئی ٹیکسی روکے اور زخمی کتے کو اسپتال پہنچائے۔ دوسری آواز آئی کہ پہلے اسے پانی تو پینے دیجئے۔ ارے کوئی بیچارے بڈھے کے لئے ابھی تک کرسی کیوں نہیں لایا۔ ٹیکسی کے پیسے آپ کے پاس ہوں گے؟ اور کتے کے ٹریٹمنٹ کے لئے؟ میں نے دیکھا کہ اردگرد کھڑی خواتین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں اور مرد بھی افسردہ کھڑے ہیں۔ کرسی پر ہانپتے کانپتے بڈھے کو سب دلاسہ دینے لگے کہ بابا جی! یہ بالکل ٹھیک

ہو جائے گا،معمولی سا زخم ہے ۔ارے کوئی ٹیکسی رو کے جلدی سے،ایک خاتون نے آواز اٹھائی کہ جانوروں کا ہسپتال کہیں بند ہی نہ ہو جائے!! دیر ہو رہی ہے۔ایک ادھیڑ عمر خاتون جو کہ ابھی چم چم کرتی نئی مرسڈیز کار سے اتری تھی، کہنے لگی ٹیکسی روکنے کی ضرورت نہیں، کتے اور اسکے بڈھے مالک کو میں اسپتال پہنچادیتی ہوں۔روسی کتے کا بوڑھا مالک جو معمولی لباس پہنے ہوئے غریب آدمی دکھائی دے رہا تھا۔کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا،لوگوں نے اپنا اپنا مشورہ دیا کہ کتے کو کیسے پکڑیں،اسی دوران کسی نے اسے سفید پٹی بھی باندھ دی تھی تا کہ زیادہ خون نہ بہہ جائے۔خاتون نے اپنی مرسڈیز سٹارٹ کی اور دونوں کو اسپتال کی طرف لے کر روانہ ہوگئی۔عرب وعجم کے کسی مسلمان دیس میں آج تک میں نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا۔شاید رمضان المبارک کا اثر ہے،میرے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ قارئین سے یہ پوچھ لوں شائد انہوں نے کسی مسلمان ملک میں کوئی ایسا واقعہ دیکھا ہو؟فضول سوال ہے۔بھول جائیے۔چلی کی بات کرتے ہیں جس کی آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ ہے۔مقامی کرنسی پیسو ہے۔ہمارے ایک روپے میں چھ پیسو آجاتے ہیں۔

روسی کتے کے ذکر سے مجھے شہر میں آئی ہوئی روسی سرکس یاد آ گئی۔شبِ جمعہ کو بلیک میں ٹکٹ لے کر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔جس طرح ہمارے ملک میں لگی ایرانی سرکس میں کوئی ایرانی فنکار نہیں ہوتا۔اسی طرح روسی سرکس میں کسی ایک فرد کا بھی مقامِ پیدائش روس نہیں تھا۔زیادہ تو کیوبا یا پھر وینزویلا کے فنکار تھے۔لاطینی امریکہ میں ملکوں کا تصور ایشیا جیسا نہیں ہے۔یہاں ایک ملک سے دوسرے ملک چلے جانا ایسا ہی ہے جیسے ہمارے ہاں ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہے۔جنوبی امریکی ممالک میں باہمی سفر کے لئے پاسپورٹ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی،ان ممالک کے باشندے اپنے قومی شناختی کارڈ دکھا کر عالمی سرحد عبور کر لیتے ہیں۔اس کی وجہ سادہ سی ہے،ان ممالک کے درمیان دوستانہ خارجہ تعلقات ہیں۔ویسے تو اس خطۂ ارض کے لوگوں کا عمومی رویہ ہی بڑا دوستانہ ہے۔ساحل کنارے جس کیفے ٹیریا کی کرسی پر بیٹھا میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں اور سمندر کی لہروں کا شور سن رہا ہوں۔آج اس کے مالک نے مجھے میرے نام سے بلایا۔حالانکہ میں صرف ایک دفعہ پہلے یہاں

آیا تھا۔اور میری کافی کے کاغذی کپ پر میرا نام لکھنے کے لئے اس نے تعارف پوچھا تھا۔میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اوپن ائیر کیفے کے مالک سے کہا کہ تمہیں میرا نام یاد ہے؟اس پر اس نے ازراہِ مذاق کہا کہ آج تک تو یاد ہے،کل ضرور بھول جاؤں گا۔

دورافتادہ ملک کے اس چھوٹے سے جنت نظیر ساحلی شہر میں پاکستانیوں کی تعداد تین سو سے چار سو کے درمیان ہے۔بیس برس پہلے میرے بڑے بھائی کاروبار کی غرض سے اس شہر میں پہلی مرتبہ آئے تو انہیں اقیقے میں ایک سکھ ملا۔بھائی جان نے حیرت زدہ ہوکر اس سے پوچھا کہ سردار جی! آپ یہاں بھی پہنچ گئے؟ جواب میں سکھ کا کہنا تھا کہ جہاں بھی آلو پیدا ہوگا وہاں پر سکھ ضرور ہوگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سردار جی کا اقوالِ زریں ہم پاکستانیوں پر بھی صادق آتا ہے۔بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جہاں آلو نہیں بھی ہوگا،پاکستانی وہاں بھی ضرور ہوگا۔یہاں تقریباً تمام پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک ہیں۔شہر میں حضرت بلالؓ کے نام سے موسوم ایک خوبصورت جامع مسجد قائم ہے، جو انہی پاکستانیوں نے تعمیر کی ہے۔اس کے علاوہ چند مصلے بھی قائم ہیں جن میں سے ایک ہمارے شوروم کی بالائی منزل پر ہے۔کاروباری اوقات میں یہاں باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔

نرودا کے حضور

پابلو نرودا بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ تحسین کے یہ الفاظ میرے نہیں بلکہ نوبیل انعام یافتہ صحافی اور ادیب گبریل گارسیا مارکیز کے ہیں، جن سے کسی بھی صاحبِ مطالعہ شخص کا اختلاف کرنا آسان نہیں ہے۔ نرودا کے فن کے حوالے سے تذکرے تو ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں، اور اس خوش نوا شاعر کا ذکر تب تک جاری رہے گا جب تک یہ دنیا اور اس میں ادب باقی ہے۔ چلی کے اس انقلابی شاعر، ادیب، سفارتکار اور ترقی پسند سیاستدان کی شخصیت کا ایک خوبصورت پہلو ایسا ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں، اس لیے اس ہمہ جہتی شخصیت کی اس جہت کا تذکرہ بھی کم کم ہوتا ہے۔ یہ پہلو پابلو نرودا کی فن تعمیر میں دلچسپی ہے۔ اس دلچسپی کا مظہر اس کے چلی کے مختلف شہروں میں خود تعمیر کردہ تین مکانات ہیں۔ ان گھروں کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ تعمیر کے شعبے کو فن اور آرٹ کیوں کہا جاتا ہے۔ دارالحکومت سنتیا گو میں واقع رہائش گاہ کی لائبریری میں اس کے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا ایک گھر کا ماڈل پڑا ہے، جو کبھی تعمیر نہیں ہو سکا۔

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے پابلو نرودا کی تدفین اس کی وصیت کے مطابق، اسکے ازلا نیگرا کے ساحل پر واقع گھر کے صحن میں ہوئی۔ بعدازاں اسکے پہلو میں اسکی شریکِ حیات متلدے کی بھی تدفین کردی گئی۔ پابلو نرودا کی تینوں رہائش گاہوں کو عوامی میوزیم میں تبدیل کردیا گیا ہے، ان کا انتظام وانصرام اسی کے نام سے منسوب ایک فلاحی ادارہ چلاتا ہے۔ یوں تو تینوں مکانات قابل دید ہیں مگر ان میں سیاحوں میں زیادہ مقبول دارالخلافہ سنتیا گو شہر میں واقع مکان ہے۔ میرا اس شہر سے جب بھی گزر ہوتا ہے، میں اس آستانے پر حاضری کے لیے ضرور جاتا ہوں۔ ہر بار یہاں حسن اور آرٹ کا کو

ئی نہ کوئی نیا رخ آشکار ہوتا ہے۔کم وبیش چار کنال رقبے پر مشتمل اس رہائش گاہ کا نام نرودا نے اپنی محبوبہ کے گھنگھریالے بالوں کی نسبت سے ''لاچسکونا'' رکھا تھا۔ریڈ انڈین قبائل کی زبان ''کیچوا'' کے اس لفظ کا ترجمہ الجھے ہوئے بالوں والی یا پھر زلفِ پریشان کیا جا سکتا ہے،نرودا اپنی محبوبہ کو اسی نام سے بلایا کرتا تھا۔ پہاڑی پر واقع اس مکان کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ ناہموار پہاڑی کے پیچ وخم اور زیروبم کو ان کی قدرتی حالت میں ہی رہنے دیا گیا ہے۔

الگ تھلگ اک ننھی چوٹی پر واقع کشادہ لائبریری کی تمام کتابیں اور دیگر سامان تو 1973ء کی فوجی بغاوت کے وقت یہاں سے لوٹ لیا گیا تھا،اب اسے سفارتکاری کے دور میں نرودا کے زیر استعمال رہنے والی اشیاء وکتب سے سجایا گیا ہے۔دیواروں پر بلیک اینڈ وائیٹ تصاویر آویزاں ہیں، جن میں نرودا اپنے دوستوں کے ساتھ نظر آتا ہے،ان میں کئی نوبیل انعام یافتگان اور عالمی شہرت یافتہ انقلابی رہنما شامل ہیں۔پابلو پکاسو اور ڈیگوراویرا کے ساتھ پابلو نرودا کی تصاویر کے علاوہ ان مصور دوستوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی بہت ساری پینٹنگز گھر میں جا بجا سجی ہوئی ہیں۔بیڈروم میں میکسیکو کے نوبیل انعام یافتہ مصور ڈیگوراویرا، جو مصورہ فریدا کے شوہر کے طور پر زیادہ مشہور ہیں،ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی نرودا کی محبوبہ کی مبہوت کر دینے والی پینٹنگ آویزاں ہے۔محبوبہ کی الجھی زلفوں میں نرودا کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

گھر کی دیواروں پر سجی تصویروں میں نظر آنے والی شخصیات میں اگر تمام نہیں تو غالب اکثریت اشترا کی نظریات کے حامیوں پر مشتمل ہے۔یاد رہے کہ پابلو نرودا عملی طور پر سرگرم انقلابی سیاستدان تھے۔وہ چلی کی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ اور سینیٹر بھی رہے۔ان کی پارٹی کی طرف سے انہیں ملک کی صدارت کے عہدے کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا تھا مگر وہ اپنے ہمدم دیرینہ کامریڈ سالو ادور آیندے کے حق میں دستبردار ہو گئے، جو پھر انتخابات جیت کر چلی کے صدر منتخب ہوئے۔جنرل پنوچے کی قیادت میں فوجی بغاوت کے دوران دونوں دوستوں کی وفات مشکوک حالات میں ہوئی۔عوام کی غالب اکثریت کا خیال ہے کہ دونوں کو قتل کیا گیا۔چند سال قبل حکومت نے پابلو نرودا کی موت کے

اصل اسباب جاننے کیلئے ایک عدالتی کمیشن قائم کیا تھا، جس کی تحقیقات 2011ء سے ابھی تک جاری ہیں۔ حکومت وقت کا دعویٰ تھا کہ اسے دل کا جان لیوا دورہ پڑا تھا، جبکہ عمومی رائے یہ ہے کہ اسے زہر دے کر مارا گیا تھا۔ جنرل پنوچے نے نرودا کے جنازے کو عوامی اجتماع میں تبدیل ہونے سے روکنے کی خاطر سنتیا گوشہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ لوگ مگر پھر بھی کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جوق در جوق ملک کے طول وعرض سے ہزاروں کی تعداد میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر جنازے میں شریک ہوئے۔ واقفانِ حال بتاتے ہیں کہ شہر کی گلیاں اور بازار لوگوں سے کچھا کھچ بھر گئے تھے۔ محبت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے۔ موت سے ایک ماہ قبل ہی نرودا نے اپنی آپ بیتی مکمل کی تھی، فوجی بغاوت کے بعد اسکی بیوی متلدے یہ ''یادیں'' لیکر ملک سے فرار ہوگئی تھی۔ یہ آپ بیتی جس کا عنوان ''یادیں'' ہے اب اردو سمیت دنیا کی بیشتر زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اردو ترجمہ انوار زاہدی نے کیا ہے۔

ایک دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تو تعارف کے بعد انہوں نے شکوہ کیا کہ نرودا کی خودنوشت کا اردو ترجمہ انہوں نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے کیا تھا، مگر چلی کی حکومت، سفارت خانے یا کسی بھی سرکاری ادارے کی جانب سے ان کے ساتھ نہ تو کبھی رابطہ کیا گیا اور نہ ہی سرکاری سطح پر کسی طرح کی پذیرائی بخشی گئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انوار زاہدی کا یہ شکوہ اور شکایت جائز و برحق ہے۔ میں نے خود ان کی ترجمہ کردہ ''یادیں'' اردو زبان میں مکمل طور پر پڑھی ہے، انتہائی عمدہ ترجمہ کیا گیا ہے، بڑا ہی معیاری کام ہے، مشکل کام یوں تھا کہ یہ کتاب اچھی خاصی ضخیم ہے۔ میں نے مترجم کا دل رکھنے کے لئے اس سرکاری بے اعتنائی کی وجوہات تو بیان نہیں کیں مگر قارئین کے ساتھ اس متعلق ضرور بات کرنا چاہوں گا۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ سفارت خانہ اور سفارتی عملہ چاہے کسی بھی ملک کا ہو، یہ عموماً بدمزاج لوگ ہوتے ہیں، وجہ یہ ہوتی ہے کہ سب لوگوں کو انہی سے مطلب اور کام ہوتا ہے، انہیں کسی سے بھی کوئی کام نہیں ہوتا۔ پابلو نرودا سے چلی کی اشرافیہ کو ویسے بھی چڑ ہے، اس کی وجہ اس کا کمیونسٹ ہونا اور غریبوں کا نمائندہ بن کر تمام عمر متحرک رہنا اور لکھنا ہے۔ اس کا ذاتی تجربہ مجھے یوں ہوا کہ چلی

کے جاپان میں متعین ثقافتی اتاشی کو میں نے گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کے ہسپانوی سے براہ راست اردو میں کیئے گئے اپنے تراجم کی کتاب ''محبت کے دو رنگ'' پیش کی تو انہوں نے کتاب اور میری کوشش کو کافی سراہا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ فتویٰ بھی صادر فرمایا کہ گبریلا مسترال نرودا کے مقابلے میں زیادہ بڑی شاعرہ تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے گبریلا مسترال کی سفارت خانے میں تصویر بھی آویزاں تھی۔

چلی کے سرسبز و شاداب جنوبی علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے پارال میں 1904ء کو پیدا ہونے والا ریکاردو نیفتالی باسو آلتو بچپن سے ہی شاعرانہ اور سوشلسٹ مزاج رکھتا تھا۔ دس سال کی عمر میں اسکی پہلی نظم شائع ہوئی۔ فقط انیس برس کا تھا جب اسکی پہلی کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ والد کو اس کا شاعری کرنا پسند نہ تھا، اسکی وجوہات سماجی اور معاشی تھیں۔ چونکہ وہ صرف دو ماہ کا تھا جب اسکی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ شاید اسی لیے والد اس کے مستقبل کے بارے میں زیادہ حساس تھے، اپنے والد کو غچّہ دینے کیلیئے اس نے قلمی نام پابلو نرودا اختیار کر لیا۔ چیک ریپبلک سے تعلق رکھنے والا رومانوی شاعر نرودا اس کا پسندیدہ سخنور تھا۔ اسی کے نام سے متاثر ہو کر اس نے اپنا نام رکھا، بیس برس کی عمر تھی جب اس کا دوسرا شعری مجموعہ ''محبت کی بیس نظمیں'' شائع ہوا، جس نے پوری دنیا سے داد و تحسین سمیٹی۔ سارے عالم میں شہرت کے باوجود اسکے معاشی حالات دگرگوں تھے۔ دوستوئیفیسکی کے الفاظ میں حالت بیان کروں تو ''شہرت چاہے لافانی بھی ہو، اس سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا'' روزگار کی خاطر اس نے دفتر خارجہ میں نوکری اختیار کر لی۔ ذہین اور محنتی ہونے کے سبب اس نے جلد ہی نہ صرف چلی بلکہ بیرونی دنیا میں بھی ایک منجھے ہوئے سفارتکار کے طور پر خود کو منوالیا تھا۔ سیاسی حالات بدلتے ہیں تو اسے روپوشی اور جلاوطنی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس کی تفصیل نرودا کے متعلق میری کتاب ''محبت کے دو رنگ'' میں موجود ہے۔ میرے لیے یہ اعزاز ہے کہ میں نے پابلو نرودا کی شاعری کو ہسپانوی سے اردو میں ترجمہ کر کے کتابی شکل میں شائع کروایا۔ جلاوطنی کے دور میں نرودا کا تخلیقی سفر اور سیاحت دونوں بھرپور طریقے سے جاری رہے۔ اس پر اطالوی زبان میں ایک ایوارڈ یافتہ فلم بھی بنی ہے ''IL POSTINO'' جو نرودا کی جلاوطنی کے دوران اٹلی کے جزیرے کیپری میں قیام کا احاطہ کرتی ہے۔

بحری سفر سے نرودا کی رغبت کا یہ عالم تھا کہ سنیا گو کے گھر کا ایک حصہ بالکل بحری جہاز کے اندر کا ماڈل ہے۔ جبکہ دوسرے گھر میں ایک کشتی بنی ہوئی ہے۔ دونوں میں مئے خانے قائم کیے گئے تھے۔ مئے خانے اور باورچی خانے میں شیشے کے رنگ برنگے گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ شاعر کا عقیدہ تھا کہ گلاس کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ گھر میں روایتی نہیں بلکہ پتھریلی ناہموار زمین پر باغبانی کی گئی ہے، جو بذات خود آرٹ کا شاہکار ہے۔ لائبریری کے ایک کونے میں گتے اور لکڑی سے بنا ہوا ایک گھر کا ماڈل رکھا ہے، جو کہ پابلو نرودا کے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا ہے۔ نوبیل انعام، عالمی امن انعام اور لینن امن انعام یافتہ شاعر اسے تعمیر کروانا چاہتا تھا مگر زندگی نے مہلت نہ دی، 69 برس کی عمر میں وہ عالمِ رنگ و بو کو داغ مفارقت دے گیا۔

سنتیاگو کی ایک صبح

صبح کا آغاز سنتیاگو میں بلیک کافی کے ساتھ ہوا۔اس کی وجہ میری سادہ خوراکی مت سمجھئے گا بلکہ کمرے میں اور کچھ دستیاب ہی نہ تھا۔ہوٹل کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو سانتالوسیا کی پہاڑی پر ہسپانوی دور کی یادگار عمارتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

سولہویں صدی کے وسط میں جب سپین نے اس شہر کو فتح کیا تو اس پہاڑی مقام پر اپنی فتح کی یادگار تعمیر کروائی۔ڈیڑھ کروڑ سال پرانی یہ پہاڑی کبھی آتش فشاں کا دہانہ تھی،اپنی دفاعی اہمیت کی وجہ سے ہسپانوی فوجوں نے اس پر دو قلعے بھی تعمیر کروائے اور عملی طور پر اسے فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا۔وقت گزرتا گیا مگر اب بھی یہ چلی کے دارالحکومت کا مرکزی نقطہ اور سب سے مقبول سیاحتی مقام ہے۔اس شہر کے معمار ہسپانوی فاتحین ہیں اور اس کا نام بھی انہی نے انجیل مقدس سے اخذ کر کے رکھا تھا۔

سنتیاگو میں اپنے قیام کے لیے ہوٹل میں نے قصداً اس جگہ منتخب کیا تھا جہاں سے میوزیم اور تاریخی عمارات قریب ہوں،تاکہ وقت کا بہترین استعمال ہو سکے۔نیشنل میوزیم میں داخل ہو رہا تھا کہ مجھے دو خانہ بدوش لڑکیوں نے روک لیا،یورپ میں جنہیں ''روما'' اور لاطینی امریکہ میں ''خی طانو'' کہتے ہیں۔میری گفتگو کرنے میں ہچکچاہٹ دیکھ کر کہنے لگیں کہ دیکھو ہم بھی تمہاری طرح کے انسان ہی ہیں،ہم سے ڈرو مت،تھوڑی دیر بات کر لینے میں تمہارا کچھ بھی خرچ ہونے والا نہیں ہے۔اسی دوران ستر،اسی سال کے پیٹے میں ایک بزرگ جوڑا،جن کی میں نے تھوڑی دیر پہلے ان کے کیمرے سے ہسپانوی طرزِ تعمیر کے عجائب گھر کی اس عمارت کے سامنے یادگاری تصویر بنائی تھی، وہ میری مدد کو پہنچے اور بہانے سے مجھے بلانے لگے کہ میوزیم کا داخلی دروازہ اور ٹکٹ گھر اس طرف ہے،

ہمارے ساتھ آؤ!!! پھر یہ شفیق بزرگ مجھے سمجھانے لگے کہ یہ خانہ بدوش لڑکیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں، یہ تم سے تمہارا کیمرہ، بٹوہ، سارا سامان اور گھڑی، سب کچھ چرا کر لے جائیں گی اور تمہارے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ لمبے سنہری بالوں، سفید رنگت اور سبز آنکھوں والی یہ دبلی پتلی لڑکیاں بظاہر تو اتنی خطرناک نہیں لگ رہی تھیں۔ ان کے جسم پر بنے ہوئے ٹیٹو البتہ بتا رہے تھے کہ معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں ہے۔ یوں تو لاطینی امریکہ میں کئی سال گزارنے اور ہسپانوی زبان جاننے کے سبب ان ''خی طانو'' خانہ بدوشوں کے متعلق میں کئی کہانیاں سن چکا تھا، دست شناسی، ٹیرٹ کارڈ، ستارہ شناسی اور چوری چکاری تو ان کی وجہ شہرت ہے ہی، بغیر کسی پاسپورٹ اور ویزے کے سارے لاطینی امریکہ میں گھومنے پھرنے والے ان خانہ بدوشوں کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ان کی محبت مرنے اور مار دینے والی ہوتی ہے۔ مقامی بزرگ جوڑے کے سامنے مگر میں انجان بن گیا اور ان کا شکریہ ادا کیا، پھر ان کے ساتھ ہی میوزیم دیکھنے کے لیے مرکزی دروازے سے داخل ہو گیا۔

سنتیاگو شہر میں چار بڑے میوزیم ہیں، نیچرل ہسٹری، قومی تاریخی ورثہ، جدید آرٹ اور کمال فن میوزیم۔ ان کے علاوہ چار خصوصی عجائب گھر ہیں جن میں سے ایک گزشتہ صدی کی نوبل انعام یافتہ شاعرہ گبریلا مسترال سے منسوب ہے، دو اور قومی ہیرو اور ایک تاریخ دان کے نام سے نسبت رکھتا ہے۔ گبریلا مسترال کہ جن کی شاعری کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے شائع کروانے کا اعزاز مجھے حاصل ہے، ان کے نام سے میوزیم اسی سکول کی عمارت میں قائم ہے جہاں یہ عہد ساز شاعرہ اور ماہر تعلیم ننھے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتی رہی۔ پھر قومی کتب خانہ میوزیم بھی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سب عجا ئب گھروں میں داخلہ بالکل مفت ہے۔

چلی کے انقلابی شاعر پابلو نرودا کے گھر، بلکہ تینوں گھروں کو بھی عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ عجائب گھر کہنا عجیب سا لگتا ہے، سیاحتی مقام کہہ لیں، کیونکہ گھر تو تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے یہ خو ش نوا شاعر چھوڑ کر گیا تھا، ماسوا اس بات کے کہ ازلانیگرا والے گھر کے صحن میں پابلو نرودا اور اس کی بیوی متلدے کی قبروں کا اضافہ ہو گیا ہے۔

؎ بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور

ان رہائش گاہوں میں داخلے کی مگر بھاری ٹکٹ ہے، کیونکہ یہ سرکاری عمارتیں نہیں ہیں اور پابلونرودا کے نام سے قائم ایک غیر سرکاری ادارہ ان کی دیکھ بھال اور انتظام چلاتا ہے۔ لاہور میں فیض احمد فیض کا گھر بھی سیاحتی مقام میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ فیض گھر کے منتظمین جس خوبصورتی سے اس کا انتظام وانصرام چلارہے ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ فیض گھر اپنے محدود وسائل کے باوجود پاکستانی معاشرے کو ایک جدید ریاست بنانے میں قابل قدر کردار ادا کر رہا ہے۔ اس ادارے میں آویزاں فیض صاحب اور پابلونرودا کی تصویر بتاتی ہے کہ رومان اور انقلاب کے داعی ان دونوں شعراء میں کافی گہرا تعلق تھا۔

چلی کوئی امیر ریاست نہیں ہے اور نہ ہی اس کے پاس لامحدود وسائل ہیں مگر سنتیا گو شہر کے ایک درجن عجائب گھروں کا تذکرہ تو میں آپ سے کر ہی چکا ہوں۔ لاہور شہر سنتیا گو سے بڑا ہے مگر پورے شہر میں صرف ایک ہی مرکزی عجائب گھر ہے اور وہ بھی انگریز کا تعمیر کردہ۔ اسلام آباد کا لوک ورثہ اور مونومنٹ بھی حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں اور کراچی کا حال بھی کوئی مختلف نہیں ہے۔ ہمارے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں تو یہ ادارے موجود ہی نہیں ہیں۔ عجائب گھر قومی تعمیر وترقی میں یوں اہم ہیں کہ یہ عوام کا رشتہ دھرتی سے مضبوط کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ماضی اور حال میں تعلق پیدا کر کے مستقبل کی سمت کا تعین کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ شہر کا مرکز انیسویں صدی کے کلاسیکی طرز تعمیر کا شاہکار نمونہ ہے جس میں کہیں کہیں جدید طرز تعمیر کے خوبصورت پیوند بھی نظر آجاتے ہیں۔ شہر کے عین وسط میں بہنے والے ماپوچو دریا کو سنتیا گو میں وہی مقام حاصل ہے جو لاہور میں نہر کو اور لندن شہر میں دریائے تھیمز کا مقام ہے۔ چاروں اطراف سے برف پوش لاس آندلیس کی پہاڑیوں میں گھرے اس شہر کا زیر زمین ریلوے نظام جنوبی امریکہ میں سب سے جدید، بڑا اور مثالی ہے۔ عوام الناس کی بڑی اکثریت اسی زیر

زمین ریلوے اور میٹرو بس کو آمدورفت کے لیے استعمال کرتی ہے جس کی وجہ سے شہر کی سڑکوں پر زیادہ گاڑیوں کا رش نظر نہیں آتا۔

شہر کے مضافات میں انگور کے باغات کا طویل سلسلہ ہے، انہی انگوروں سے کشید کردہ وائین اس وقت دنیا میں فرانس کے بعد سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہے۔ شراب کشید اور فروخت کرنے والی ایک کمپنی کے یہودی مالک سے ائیر پورٹ پر ملاقات ہوئی تو اس نے عجیب انکشاف کیا، کہنے لگا کہ چلی میں انگور کے باغات اور شراب کشید کرنے والے تقریباً تمام اداروں کے مالکان وہی یہودی خاندان ہیں جو گزشتہ صدی میں اہل یورپ کے متعصب رویوں کے سبب ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ فرانس اور سپین سمیت یورپ کے بیشتر ممالک میں ان کے رشتہ دار ہی شراب ساز اداروں کے اب بھی مالکان ہیں۔ اسی دوران گڈمین نامی اس یہودی کا فون آ گیا، اس نے اپنی بیوی کو بڑی نرمی سے بتایا کہ میں اس وقت ایک پاکستانی نوجوان سے بات چیت میں مصروف ہوں، فارغ ہو کر تمہیں فون کروں گا۔ بتانے لگا کہ میرے پاس چلی کے علاوہ اسرائیل کا بھی پاسپورٹ ہے مگر میں اسرائیلی پاسپورٹ کو سفر کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ اگر جہاز اغوا ہو جائے تو ہائی جیکر چاہے کہیں کے بھی ہوں، پہلی گولی وہ اسرائیلی یہودی کو ہی مارنا پسند کریں گے۔ اسرائیلی ریاست کے غیر فطرتی قیام کی یہ قیمت تو یہودیوں کی آئیندہ آنے والی نسلوں کو بھی ادا کرنا پڑے گی۔

شاعروں اورادیبوں کا وطن

اس کرۂ ارض پرانسان کا قدیم ترین مسکن یہ دیس ہے۔ ماہرین آثارِقدیمہ کے مطابق چلی میں بہتر ہزار سال قبل انسانی زندگی کے آثار ملے ہیں۔ ذاتی طور پر مگر میں یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ یہی بات میں دنیا کے آدھ درجن ممالک میں ان کے متعلقہ اوصاف کی فہرست میں سُن چکا ہوں۔ حال ہی میں سری لنکا میں وہ پہاڑی چوٹی دیکھی جس پر حضرت آدمؑ کے پاؤں کا نشان ثبت ہے ،انہی کے نام یہ چوٹی ''ایڈمز پیک'' موسوم ہے۔ مبینہ طور پراس جگہ پہلے انسان اور خدا کے پیغمبر کا نزول ہوا تھا۔ اسلام، بدھ مت اور عیسائیت کے پیروکاروں کے لیے مذکورہ مقام یکساں طور پر متبرک اور عباد ت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ چلی کی پوری دنیا میں البتہ ایک انفرادیت ایسی ہے جو کہ غیر متنازعہ ہے اور پور ے وثوق سے کہی جاسکتی ہے، ملک کے اندر اور عالمی سطح پر چلی کو شاعروں کا وطن اور ادیبوں کی سرزمین ما نا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ کے حسین دیس کے لیے یہ خطاب اور اعزازی جملے محض لفاظی یا شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے، بلکہ اس کی ٹھوس اور تاریخی وجوہات ہیں جو اس توصیف کو برحق ثابت کرتی ہیں۔

لاطینی امریکہ میں ادب کا پہلا نوبل انعام گبریلا مسترال کو دیا گیا جو کہ چلی میں پیدا ہوئیں، یہیں پر پلی بڑھیں، شاعری کا آغاز اور اشاعت کا سلسلہ بھی اسی حسین دیس سے کیا۔ سفارت کاری اور تعلیم کے شعبے میں عالمی سطح پر اپنے ملک کی نمائندگی کی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اپنی زندگی میں ہی وہ اتنے بلند مقام پر پہنچ چکی تھیں کہ اٹلی کے مطلق العنان آمر مسولینی نے انہیں وزارت کی پیشکش کی جسے گبریلا مسترال نے ٹھکرا دیا، کیونکہ نرم خو شاعرہ جمہوریت اور انسانی حقوق کے تحفظ میں یقین رکھتی تھی۔ نقشہ دیکھیں تو جنوبی امریکہ میں ارجنٹائن اور برازیل کے پہلو میں ایک طویل ساحلی پٹی ''سبز

مرچ'' کی طرح دکھائی دیتی ہے، قرین قیاس یہی ہے کہ ثابت مرچ جیسی شکل کی بنیاد پر ہی اس ملک کا نام چلی رکھ دیا گیا ہے۔ ارجنٹائن اور چلی کے درمیان سینکڑوں میل تک پھیلے لاس آندلیس کے برفیلے پہاڑ جن کی برف پوشی کے سبب اردگرد کے نواحی شہروں کا موسم بھی سرد رہتا ہے، ذہن میں آتا ہے کہ شاید وہ ٹھنڈک اس چلی نام کا سبب ہو؟ حقیقت میں مگر ایسا نہیں ہے۔ سرخ مرچ، برفانی پہاڑ اور انٹارکٹکا کا سرد موسم چلی کی وجہ تسمیہ نہیں ہیں۔ دراصل قدیم قبائل کی زبان کے مطابق چلی کا مطلب خشکی کا آخری ٹکڑا یا پھر زمین کا آخری حصہ ہے۔ یہاں یہ تذکرہ کرتا چلوں کی براعظم انٹارکٹکا کا کچھ حصہ چلی کی عملداری اور بہت بڑا حصہّ اس کی دعویٰ داری میں آتا ہے۔

پابلو نرودا کے ذکر کے بغیر عالمی ادب کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ اس خوش نوا شاعر کو نوبیل انعام ملنے سے کہا جاتا ہے نوبیل انعام کی تکریم میں اضافہ ہوا ہے، چونکہ نرودا نے اسے قبولیت بخشی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دنیا میں پابلو نرودا زیادہ مقبول ہیں یا پھر چلی کو زیادہ لوگ جانتے ہیں۔ ذاتی حوالے سے بات کروں تو میں نے پابلو نرودا کا نام پہلے سنا تھا اور اس کے حوالے سے چلی کا تذکرہ بعدازاں سننے میں آیا کہ یہ بھی لاطینی امریکہ کا ملک ہے۔ دو کروڑ آبادی کے اس ملک کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس ملک کا مجموعی رقبہ پاکستان سے تھوڑا سا کم ہے یعنی عالمی فہرست میں پاکستان چھتیسواں بڑا ملک ہے اور چلی اٹھتیسواں ملک شمار ہوتا ہے۔ ملک میں صدارتی نظام ہے اور موجودہ صدر محترمہ باچلیت ہیں، جو کہ سوشلسٹ پارٹی کی رکن ہیں۔ محترمہ باچلیت کے والد پابلو نرودا کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ یادرہے کہ پابلو نرودا فقط شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک منجھے ہوئے سفارت کار اور سیاستدان بھی تھے۔ کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے ان کو ملک کی صدارت کے لیے انتخابی امیدوار نامزد کیا گیا تھا اور وہ سینیٹر بھی رہے تھے۔

پابلو نرودا نے اپنی سیاسی جدوجہد اور سماجی کاوشوں سے یہ ثابت کیا کہ شاعر اور اہل قلم کا منصب فقط یہ نہیں کہ گردوپیش کے حالات سے متاثر ہو کر ان کو ضبطِ تحریر میں لے آئے بلکہ اپنے سماج کو سدھارنے اور اردگرد کے حالات کو مثبت انداز میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری بھی اس کے کاندھوں پر آتی ہے۔ پابلو نرودا بھی گبریلا مسترال کی طرح چلی کے جنوبی علاقہ میں پیدا ہوا جو کہ بہت سرسبز ہے،

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان دونوں عظیم شعراء کی شاعری کو میں نے ہسپانوی زبان سے براہِ راست اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ان شعراء کی جائے پیدائش کا تذکرہ کرنے کا مقصد وہ پس منظر اور فطرتی ماحول ہے جس میں ان کی شاعری پروان چڑھی ہے۔یوں تو اس ملک کے تقریباً ہر شہر کو ساحل سمندر کی نعمت میسر ہے مگر شمال کا علاقہ خشک مٹیلے پہاڑوں اور جنوبی علاقہ سرسبز اور برف پوش پہاڑوں پر مشتمل ہے۔سولہویں صدی میں یہاں ہسپانوی نوآبادیاتی نظام قائم ہوا، اس سے پہلے یہ قدیم ''اِن کا'' ریاست کی عملداری میں تھا۔دارالحکومت سنتیا گو کی بنیاد 1540ء میں ہسپانوی سلطنت نے رکھی۔آزادی کا اعلان 1810ء میں کیا گیا اور اس جدوجہد میں ارجنٹائن کے حرِیت پسندوں نے چلی کی بہت مدد کی، بلکہ ملک کا پہلا صدر بھی ارجنٹائن سے تعلق رکھتا تھا۔ابتدا میں اس ملک کا رقبہ خاصا مختصر تھا مگر 1880ء میں جنگِ بحرالکاہل میں فتح یاب ہو کر پیرو اور بولیویا کا بہت سارا رقبہ چلی کے قبضے میں آ گیا۔جنگ کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا چونکہ اس متعلق ہر ملک کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے جو کہ دشمن ملک سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔کہتے ہیں جنگ میں پہلا قتل سچائی کا ہوتا ہے۔

جغرافیائی اور حیاتیاتی اعتبار سے یہ ملک انتہائی متنوع ہے۔گورنمنٹ کالج لاہور میں قائم شعبہ نباتیات سے وابستہ میرے استاد کی ''خواہشِ مرگ'' تھی کہ کسی طرح وہ چلی پہنچ جائیں۔یہ لفظیات کی بات نہیں، سائنسی اعتبار سے ایسی متنوع، زمین، آسمان اور حیات دنیا بھر میں کم کم پائی جاتی ہے۔جیسی اس خطے میں ہے۔فطرت کی یہ رنگارنگی اور تنوع ہی وہ سبب ہے کہ یہاں ایسے شاعر، ادیب اور فنکار پیدا ہوتے ہیں جن کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔اس وقت ہسپانوی زبان میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی مصنفہ اور ادیبہ چلی کے سابق انقلابی صدر آیندے کی بھتیجی ازابیل آیندے ہیں۔یہاں یہ تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ ہسپانوی زبان فقط سپین سے ہی متعلق نہیں رہی ہے، بلکہ اس وقت یہ انگریزی کے بعد دنیا کے سب سے زیادہ ممالک میں بولی جانے والی زبان ہے۔پچاس کے قریب ممالک کی اس فہرست میں ازابیل آیندے کی اب تک پانچ کروڑ سے زیادہ کتب شائع ہو کر فروخت ہو چکی ہیں۔امریکی صدر بارک اوباما نے انہیں 2014ء میں تمغۂ آزادی دیا۔ازابیل آیندے بیس سے زائد ناول لکھ چکی ہیں اور کئی دیگر کتب بھی انہوں نے تحریر کی ہیں۔یاد رہے کہ

ازابیل آیندے کے چچا سلوادور آیندے کا تختہ الٹنے میں امریکی سی آئی اے اور اس کے F16 طیا روں نے با قاعدہ حصہ لیا تھا۔آیندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر صدر بنا تھا،مگر وہ سرد جنگ کا زما نہ تھا اور امریکہ دائیں بازو کی ہر فوجی بغاوت کا حامی تھا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ کیمونسٹ پارٹی نے صدارتی امیدوار کے لئے پابلو نرودا کو چنا تھا مگر وہ اپنے دیرینہ دوست آیندے کے حق میں دست بردار ہو گیا۔آیندے خود بھی ایک ترقی پسند مصنف تھا، پابلو نرودا اس کی حکومتی کابینہ کا حصہ تھا۔عہد حا ضر کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالیں تو ایک دلچسپ پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ چلی کے دس مقبول ترین مصنّفین میں سے آٹھ خواتین ہیں۔

فٹ بال کا قدیم ترین ٹورنامنٹ

سان تیاگو کے ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی کوپا امریکہ 2015 کے رنگا رنگ خیر مقدمی بینروں نے استقبال کیا۔ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والی بارہ ٹیموں کے قومی پرچم جگہ جگہ آویزاں تھے۔اورفٹ بال کے جنوبی امریکی کھلاڑیوں کی تصاویر کے پوسٹر تمام شہر میں نمایاں مقامات پر دیکھے جا سکتے تھے۔لوکل فلائیٹ کے لیے مقامی ائیر لائن کے جہاز پر سوار ہوا تو ہر سیٹ کے سرہانے سفید سیٹ پوش پر دنیا بھر سے آنے والے فٹبال کے شائقین کے لیے چلی آمد پر خوش آمدیدی پیغام لکھا تھا۔فٹ بال کی تاریخ کے اس پہلے ٹورنامنٹ کی ابتداء 1916ء میں ہوئی تھی۔ارجنٹائن جنوبی امریکہ کے ممالک کے مابین ہونے والے اس پہلے عالمی مقابلے کا میزبان بھی تھا اور فاتح بھی۔کوپا امریکا جسے اب امریکن کپ بھی کہا جاتا ہے، اپنی ابتدا کے بعد ہر سال منعقد ہوتا تھا اور اس کا مقبول نام ''جنوبی امریکی کپ'' تھا۔اب یہ ٹورنامنٹ دنیا میں سب سے زیادہ دیکھے جانے والے کھیل کے مقابلوں میں سے ایک ہے۔ٹورنامنٹ کے ابتداء سے لیکر انتہا تک پورا مہینہ میں چلی میں رہا جو کہ ان فٹ بال مقابلوں کا فاتح اور میزبان تھا۔

کوپا امریکہ جیتنے کے لیے چلی کو 99 برس انتظار کرنا پڑا۔2015 کے مقابلوں سے پیشتر چلی چار مرتبہ فائنل میں پہنچا تھا مگر کبھی بھی فتح اس کا مقدر نہ بن سکی تھی۔چلی کے لئے ایک صدی پر محیط یہ انتظار اس وقت ختم ہوا جب جنوبی امریکہ میں فٹ بال کے بانی ملک ارجنٹائن نے فائنل مقابلے میں اپنی پنلٹی شوٹ پر گول کرنے میں ناکامی کا سامنا کیا اور چلی کے کھلاڑی کامران رہے۔

لاطینی امریکہ میں پہلے فٹ بال میچ کی تاریخ 1867ء میں ارجنٹائن میں کام کرنے والے

برطانوی نژاد ریلوے اہلکاروں کے درمیان ملتی ہے۔ پہلی ٹیم بھی امریکی براعظموں میں ارجنٹائن نے ہی تشکیل دی تھی۔ یہ انیسویں صدی کے آخری سالوں کا واقعہ ہے۔ فٹ بال کا پہلا عالمی مقابلہ بھی 1910ء میں ارجنٹائن نے ہی منعقد کروایا مگر اسے فٹ بال کی عالمی تنظیم کی تائید حاصل نہیں تھی۔ مذکورہ میچ میں یوراگوئے اور چلی کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ بہرحال 1916 میں موجود ''جنوبی امریکی فٹ بال چیمپئن شپ'' کے نام سے اس عالمی مقابلے کی ابتداء ہوئی، جو عالمی سطح پر تسلیم شدہ قدیم ترین ٹورنامنٹ ہے۔ برازیل، یوراگوئے اور چلی شرکت کے لیے ارجنٹائن آئے اور یوراگوئے اس ٹورنامنٹ میں کامیاب و کامران قرار پایا۔ سو سال سے جاری اس ٹورنامنٹ کے فائنل مقابلوں میں بارہ ممالک کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں، ان میں سے دس ٹیمیں مستقل جب کہ دو ٹیمیں شمالی امریکی براعظم سے لی جاتی ہیں، عموماً میکسیکو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ٹیمیں شرکت کا اعزاز حاصل کرتی ہیں۔ یہ ٹورنامنٹ ایک مہینہ جاری رہتا ہے۔ اب تک یوراگوئے سب سے کامیاب ٹیم ہے جو کہ پندرہ مرتبہ یہ ٹورنامنٹ جیتی ہے، دفاعی چیمپئن بھی وہی تھی مگر اس مرتبہ کوارٹر فائنل میں پنلٹی ککس پر ارجنٹائن سے شکست کھا گئی۔ اگر ارجنٹائن کی ٹیم فائنل جیت جاتی تو سب سے زیادہ مرتبہ کوپا امریکہ جیتنے کا یوراگوئے کا ریکارڈ برابر ہو جاتا۔ کوپا امریکہ کے میزبان ممالک کی میزبانی کا فیصلہ بھی بڑے دلچسپ انداز میں ہوتا ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے، دس مستقل ممالک کے نام کا پہلا حرف اور اگر وہ حرف دو ممالک میں مشترک ہے تو پھر ان کا دوسرا حرف، اس طریقے سے جنوبی امریکہ کے تمام ممالک کو لازم طور پر میزبانی کا موقع ملتا ہے۔ وینیز ویلا کے بعد 2011ء میں ''A'' سے ارجنٹائن کی باری آئی، اس طرح چار سال بعد 2015ء کا ٹورنامنٹ تکنیکی طور پر ''بی'' سے برازیل کا حق تھا۔ مگر 2014ء کے فیفا ورلڈ کپ اور پھر 2016 کے برازیل میں منعقد ہونے والے اولمپک مقابلوں کی وجہ سے یہ مقابلہ بھی برازیل میں ہی ہونا غیر مناسب لگ رہا تھا۔ اسی بنیاد پر امریکہ نے 2015ء کے کوپا امریکہ کی میزبانی کی خواہش کا اظہار کیا تھا، جسے اصولی طور پر رد کر دیا گیا۔ امریکی اعتراض چونکہ معقول تھا اس لیے آئندہ ٹورنامنٹ کے میزبان چلی اور برازیل نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی سرزمین پر کھیلے جانے والے ٹورنامنٹ کا باہمی تبا

دلہ کر لیں۔ لہذا اب 2019ء کا کوپا امریکہ ''سی'' سے چلی کی بجائے ''بی'' سے برازیل میں منعقد ہوگا ،جبکہ 2015ء کا میزبان چلی بن گیا۔ البتہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بھی ناراض نہیں کیا گیا اور کوپا امریکہ کے اگلے سال منعقد ہونے والے یادگار صدسالہ ٹورنامنٹ 2016ء کی میزبانی اسے دے دی گئی ہے۔

ٹیلی وژن پر 2015ء کے فٹ بال مقابلوں میں اسٹیڈیم کے اندر کے حالات تو آپ نے ملاحظہ فرمائے ہوں گے، کھیل کے میدان سے باہر کے مناظر بھی ناقابلِ فراموش تھے۔ تمام شہروں کے اہم بازاراور ریستوران کے باہر میچ کی اطلاع اور ٹی وی پر دکھائے جانے کا اہتمام ،حکومت کی طرف سے دارالحکومت کے سب سے اہم چوک اور اہم شہروں میں بڑی بڑی اسکرینیں نصب کی گئی تھی۔ جن پر لائیو میچ دیکھنے کے لیے لوگوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔ شائقین کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے ہر سائز کے باجے اور شہر میں تو قومی پرچموں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ پرچموں پر مبنی ٹوپیاں، مفلر اور گاڑیوں پر پرچم۔ سب سے دلچسپ صورت حال یہ تھی کہ اگر آپ کسی وجہ سے میچ نہ دیکھ رہے ہوں تو یکدم گاڑیوں کے ہارن، پٹاخے، آتش بازی اور لوگوں کا شور بتا دیتا تھا کہ چلی نے گول کر دیا ہے، ہاں !!! البتہ خاموشی چھانے سے گمان ہوتا کہ لگتا ہے چلی کو گول ہو گیا ہے۔ پورے ملک میں ایک مہینہ گفتگو کا ہر جگہ واحد موضوع فٹ بال اور کوپا امریکہ ہی رہا۔ لاطینو لوگ تو عام دنوں میں بھی جشن منانے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں، جب کسی ملک کو کوپا امریکہ کی میزبانی کا موقع مل جائے پھر تو اس دیس کے باشندے ٹورنامنٹ کے دوران کوئی بھی پیداواری کام کرنا گناہ کبیرہ اگر نہیں تو صغیرہ گناہ ضرور سمجھتے ہیں۔

پابلو نرودا کے آنگن میں ایک دوپہر

اس وقت میں پابلو نرودا کے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں۔ یہ مکان نوبیل انعام یافتہ انقلابی شاعر اور سیاستدان نے اپنی محبوبہ کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ اس رہائش گاہ کا نام بھی نرودا نے اسی حسینہ کی گھنی زلفوں کی نسبت سے رکھا تھا، ''لا چسکونا'' گھنگھریالے بالوں والی یہ خاتون خوش نوا شاعر کی تین بیویوں کے علاوہ تھی۔ میرے قریب بنچ پر برازیل کا ایک نوجوان شاعر بیٹھا ہوا ہے، ابھی ابھی بتا رہا تھا کہ اس کی ذاتی شاعری فرانسیسی اور ہسپانوی زبان کے علاوہ پرتگیزی زبان میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ پابلو نرودا کے آستانے کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اس گھر کی فضا محبت سے معطر ہے، گھر کی ایک ایک اینٹ سے محبت چھلکتی ہے۔ میں نے اپنا تعارف بطور شاعر کروایا تو کہنے لگا کہ یہ کُنجِ عافیت تو دنیا بھر کے شاعروں کے لیے ویٹی کن کا درجہ رکھتا ہے۔ ناہموار پتھریلی پہاڑی کے دامن میں واقع اس
مکان کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ وہاں پر پہلے سے موجود کوئی ایک درخت بھی نہیں کاٹا گیا، اور پہاڑی کے فطرتی پیچ وخم کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کم وبیش چار کنال کے رقبے پر پھیلے اس مکان کو بناتے ہوئے جس تعمیری مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ یہ گھر قطعی طور پر مہنگا نہیں لگتا، بالکل سادہ، مگر آرٹ کا ایک شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ بڑے بڑے گھر مہنگے تو نظر آتے ہیں۔ مگر خوبصورت کم کم نظر آتے ہیں۔ شاید تعمیر کروانے والے مالکان کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ مکان مہنگا نظر آئے، خوبصورت بھلے نہ ہو۔

اس مکان کی سیر سے پابلو نرودا کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہوتا ہے، اسے فن تعمیر سے بے حد لگاؤ تھا۔ فن تعمیر سے اس کی دلچسپی کا مظہر وہ تین مکان تو ہیں ہی جو اس نے خود ڈیزائن

کیے اور اپنی نگرانی میں تین مختلف شہروں میں تعمیر کروائے ، ایک اور مکان کا ماڈل اس گھر کی لائبریری ، جس کے آنگن میں اس وقت میں براجمان ہوں ، پڑا ہوا ہے ۔ نرودا اس مکان کو تعمیر کروانا چاہتا تھا مگر وقت نے وفا نہیں کی اور شاعر کا یہ خواب حقیقت کا روپ نہ دھار سکا ۔ کیسے دلچسپ پہلو ہیں اس انوکھے گھر کے ، جن میں سے ایک یہ پہلو بھی کہ ہر موڈ کے لیے شاعر نے الگ کمرہ بنا رکھا تھا ۔ اگر کسی صبح نا سٹلجیا محسوس ہوا تو پھر وہ دن ناسٹلجیا کے لیے مخصوص کمرے میں گزرتا ، خوشی اور غمگین موڈ کے لیے کمرے الگ الگ رکھے تھے ۔ عین ممکن ہے کہ بعض قارئین کنفیوژن کا شکار ہو جائیں کہ میں نہ جانے دنیا کے کس کونے کا تذکرہ کر رہا ہوں ؟ عرض ہے کہ میں اس وقت لاطینی امریکہ کے ملک چلی کے دارالسلطنت سنتیا گو سے آپ سے مخاطب ہوں ۔

چلی کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے سرد موسم اور سالم سبز مرچ سے مشتق ہونے سمیت کئی روایا ت موجود ہیں ۔ اس بارے میں سب سے دلچسپ اور قرین قیاس روایت قدیم مقامی قبائل اور انہی کے نام سے منسوب زبان ماپوچو سے ماخذ ہے ۔ ماپوچے زبان میں چلی کا مطلب خشکی کا آخری کنارہ ہے ، اسے زمین کا خاتمہ کے طور پر بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے ۔ یہ تاریخی ماپوچے روایت اس لیے بھی دل کو لگتی ہے کہ زیادہ منطقی اور دھرتی سے جڑی ہوئی ہے ۔ اگر دنیا کا نقشہ اٹھائیں تو چلی کی پٹی کے آگے بحرا لکاہل اپنی اتھاہ گہرائیوں اور بے پناہ وسعتوں سے لبریز نظر آتا ہے ۔ یہ ملک کئی لحاظ سے منفرد ہے ، لاطینی امریکہ کا یہ وہ ملک ہے جس کے باشندوں کی غالب اکثریت نسلی اعتبار سے یورپی نژاد ہے ۔ خوبصورتی اس معاشرے کی مگر یہ ہے کہ نسل پرستانہ رویہ یہاں معدوم ہے ۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ برسوں یہاں سکونت پذیر رہے اور مسلسل رابطے کے باوجود مجھ پر گزشتہ سال یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ملک کی اکثریتی آبادی یورپی النسل ہے ، وہ بھی یوں کہ میں یہاں کے ایک کرنسی نوٹ پر چھپی ایک فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر اس کی تاریخ ڈھونڈنے نکلا تھا ، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سپاہی دارالحکومت سنتیا گو کا بانی اور معمار پیدرو دی بالدیویا ہے ، موصوف ہسپانوی نژاد ہیں ۔ مجھے تھوڑا تعجب ہوا ، کیونکہ مقامی لوگ تو کبھی بھی غیر ملکی نو آبادیاتی حکمرانوں کو اپنا ہیرو تسلم نہیں کرتے ، دنیا کا چاہے کوئی بھی ملک ہو ۔ اس کے

ساتھ ہی یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی کہ ملک کی غالب اکثریت ہسپانوی، جرمن، فرانسیسی، ودیگر یورپی ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔

عالمی تاریخ میں چلی دنیا کا پہلا ملک تھا جہاں آزادی کے حصول کے لیے ریفرنڈم منعقد ہوا، لوگوں کی واضح اکثریت نے علیحدگی کے حق میں ووٹ ڈالا۔ یہ واقعہ بہت ہی مزے کا ہے، ہوا یوں تھا کہ فرانسیسی فاتح جرنیل نپولین بوناپارٹ نے سپین فتح کرنے کے بعد اپنے حقیقی بھائی کو 1808 ءعیسوی میں ہسپانیہ کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ چونکہ چلی میں غالب اکثریت ہسپانوی النسل لوگوں کی تھی اور وہ ہسپانیہ کی عملداری میں ہی تھا تب تک تو سب ٹھیک تھا ،مگر یورپ ہی کی کسی دوسری ریاست کی اپنے اوپر حکمرانی مختلف نوعیت کا معاملہ تھا۔لہٰذا فرانسیسی نژاد نپولین بوناپارٹ کے بھائی کو لوگوں نے اپنا بادشاہ قبول کرنے سے انکار کیا اور ہسپانیہ سے علیحدگی کا راستہ اختیار کیا، سن 1810 میں عوام نے چلی کی خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔آج پونے دو کروڑ آبادی والے اس ملک کا بیس فیصد رقبہ گزشتہ سے پیوستہ صدی کے آخر میں بولیویا اور پیرو سے ہونے والی جنگ کے نتیجے میں چلی نے اپنے قبضے میں لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمال کے رہنے والے لوگ اپنی شکل وصورت سے پیرو اور بولیویا کے باشندے نظر آتے ہیں۔ایک دفعہ ہماری سیکرٹری کی والدہ ہمارے شوروم پر آئی تو میں نے پوچھ لیا کہ کیا وہ پیرو کی رہنے والی ہے؟ خاتون نے وضاحت کی کہ وہ میری سیکرٹری کی والدہ ہے، بعدازاں اس خاتون نے اپنی بیٹی کو احتجاج ریکارڈ کروایا۔سیکرٹری روساسیگو ویا نے پھر وہی احتجاج مجھ تک پہنچایا کہ میں نے اس کی ماں کو پیرو کی باشندہ کہا ہے، جو کہ شاید نسلی اعتبار سے ان کے نزدیک کمتر قومیت ہوگی، خدا گواہ ہے کہ میں نے جو دیکھا وہی کہا تھا۔تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو میں نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔

یوں تو پابلو نرودا کے سنتیا گو میں واقع جس گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں وہ مرجع خلائق ہے مگر لا نیگرا والے مکان کی اہمیت زیادہ ہے۔اول وجہ تو یہ ہے کہ نرودا اور اسکی بیوی متلدے اس گھر کے آنگن میں مدفون ہیں، دوم، نرودا کی دنیا بھر کی سیاحت اور کئی ملکوں میں سفارتکاری کے دوران اکٹھی ہونیوالی سوغاتیں، نشانیاں، عجائبات اور فن پارے، اسی فیصد اس گھر میں موجود ہیں۔ عجیب وغریب اشیاء

اکٹھی کرنے کا پابلونرودا کو بہت شوق تھا، بلکہ جنون کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ گھر کا فرنیچر ایسا ہے کہ کوئی چیز دوسری سے نہیں ملتی، ماسوائے ڈائینگ ٹیبل کی کرسیوں کے، وہ بھی آپس میں تو ضرور ملتی ہیں مگر دنیا میں ایسی عجیب کرسیاں کم از کم میں نے تو اور کہیں نہیں دیکھی ہیں۔ تینوں گھروں میں دو، دو، مے خانے ہیں، جن میں رنگین گلاس اور جام رکھے ہیں، پیلے، سبز، نیلے، سرخ، شاعر کا عقیدہ تھا کہ جام کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔

نرودا کے گھروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سمندر سے خصوصی لگاؤ تھا۔ پابلونرودا فاؤنڈیشن جو اس کے نام سے منسوب ہے، اس کے تینوں گھروں کا انتظام چلاتی ہے، جو کہ اب میوزیم بنا دیے گئے ہیں، اس کی کتابوں کی اشاعت کے اہتمام کے علاوہ دیگر تقاریب و منصوبہ جات کی دیکھ بھال کرتی ہے، اس فاؤنڈیشن کا مونوگرام مچھلی ہے۔ ازلا نیگرا والا گھر ساحل سمندر پر واقع ہے، گھر کے اوپر ایک کشتی بنی ہوئی ہے جہاں سے کھلا سمندر نظر آتا ہے، اپنے قیام کے دوران بلا ناغہ اس کشتی میں بیٹھ کر نرودا کئی کئی گھنٹے ساگر تکتا رہتا، شراب پیتا اور شعر گوئی کرتا، عہد ساز شاعر اور کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے ملک کی صدارت کے منتخب امیدوار، عاشق مزاج فنکار کا کہنا تھا کہ ایک خاص وقت کے بعد اس کشتی میں بیٹھے ہوئے وہ خود کو سمندری سطح پر سفر کرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لا چسکونا میں بھی ایک بحری جہاز کا ماڈل گھر کا اہم حصہ ہے، گائیڈ کے بقول نرودا اکثر اس بحری جہاز میں بنے کپتان کے کیبن میں سو جاتا تھا۔ سیاسی جلاوطنی کے دوران اٹلی کے جزیرے کیپری پر نرودا کا قیام رہا، وہاں پر بھی سمندر کے ساحل پر ہی رہائش اختیار کیے رکھی۔ اس قیام کے متعلق اطالوی زبان میں ایک ایوارڈ یافتہ فیچر فلم بھی بنی ہے جس کا نام ''IL POSTINO'' ہے۔ جلاوطنی کے دوران جو ڈاکیا اس کو ڈاک لا کر دیتا تھا نرودا کی اس کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی۔ چلی واپسی کے بعد نرودا نے اس ڈاکیے سے فرمائش کی تھی کہ وہ کیپری کے ساحل سمندر کی لہروں کی آواز ریکارڈ کر کے اس کو بھیجے، جس کی مذکورہ ڈاکیے نے تعمیل بھی کی تھی۔ جس شخص کو ادب کے نوبیل انعام یافتہ لوگ بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں سب سے بڑا شاعر مانیں اور جس کی نظم ''ماچو پیچو کی بلندیاں'' کو میساچیوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سر

براہ ''انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم'' قرار دیں وہ شاعر عام زندگی میں بھی عام لوگوں سے اتنا سا تو مختلف ہوگا ہی۔

پابلو نرودا کے گھر جاتے ہوئے ایک گلی کا موڑ مڑا تو سڑک کا نام کنداں تھا، شارع 21 مئی، لاطینی امریکہ کے مما لک میں اہم تواریخ کے نام پر سڑکوں اور گلی محلوں کے نام رکھے جانے کا رواج بہت مقبول ہے۔ 5 اگست، 11 ستمبر، 16 نومبر، 25 دسمبر، یکم جنوری، یہ سب یقیناً تاریخیں ہیں مگر چلی کے ہر دوسرے شہر میں یہ سڑکوں کے نام بھی ہیں ۔پچھلی مرتبہ اس گھر کی سیر ہمیں گائیڈ لڑکی اینخلا نے کروائی تھی، مگر اس بار استقبالیے پر ہمیں برقی ہیڈ فون تھما دیے گئے، جن سے آپ اپنی پسندیدہ زبان میں، اس گھر کی تاریخ اور نرودا کی زندگی سے اسے نسبت کے بارے میں تمام اہم معلومات و تفاصیل سن سکتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوگا اگر ہماری حکومت اہم قومی ہیروز کے مکانات خرید کر ان کو اسی طرز پر عجائب گھر و ں میں تبدیل کر دے۔ اس سلسلے میں فیض گھر ایک قابل تقلید مثال ہے۔فیض احمد فیض کے اہل خانہ مبا رکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انقلاب و رومان کے عظیم شاعر کے ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع قیمتی مکان کو رضا کارانہ طور پر ایک عوامی مقام میں تبدیل کر دیا ہے۔

پسِ تحریر:

مجھے فیض احمد فیض کی ہمسائی شہناز مزمل، جو کہ خود بھی شاعرہ ہیں نے یہ بتلایا ہے کہ فیض گھر وہ مکان نہیں ہے جس میں فیض صاحب رہتے تھے، بلکہ اسی محلے میں ایک عقیدت مند نے ایک مکان خرید کر اس میں فیض گھر قائم کر کے ان کے اہلِ خانہ کے سپرد کیا ہے۔فیض صاحب کے ذاتی مکان میں اب بھی ان کے اہلِ خانہ ہی مقیم ہیں۔ البتہ فیض گھر کی تزین و آرائش کا کام ان کے بچوں نے ہی انجام دیا ہے۔

لاس بیر دیس

طویل قطاروں میں کھڑے ہوئے لوگوں میں کوئی بے چینی نظر نہیں آتی۔ سب لوگ صبر و تحمل سے اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ دھکم پیل تو دور کی بات ہے قطار میں منتظر کسی چہرے پر بے زاری اور عجلت کے آثار تک نظر نہیں آتے۔ میکسیکو شہر میں مجھے تو سب سے زیادہ اس بات نے متاثر کیا۔ پولیس نفری کی غیر معمولی تعداد اور مسلسل گشت شہریوں کو تحفظ کا احساس دلاتے ہیں جو کہ قابلِ تعریف امر ہے۔ سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر ٹورسٹ بس کی چھت پر بیٹھے، گردوپیش کے مناظر کا جائزہ لیتے ہوئے، اپنے ساتھ والی نشست پر بیٹھی شکاگو سے آئی ہوئی بڑھیا سے میں نے پوچھا کہ اس شہر کی کون سی چیز تمہیں سب سے زیادہ پسند آئی ہے؟ بڑھیا کا جواب تھا کہ اس شہر کے درودیوار کے رنگ۔ یہ شہر رنگوں میں بہت امیر ہے۔ ہاں!! ہاں!! امریکی خاتون کا مشاہدہ اور بیان مبنی بر حقیقت ہے۔ واقعی مکانوں، دکانوں اور دیگر عمارات کے جتنے متنوع رنگ اس شہر میں نظر آتے ہیں، وہ شاید دنیا کے کسی بھی اور نگر کے درودیوار پر نظر نہیں آئیں گے۔ کم از کم جتنے ممالک کی میں نے سیر کی ہے، ان میں سے کوئی بھی شہر اتنا رنگین مزاج نہیں رکھتا، جیسا شوخ اور رنگین مزاج اس شہر میکسیکو کی درودیوار کا منظر پیش کرتا ہے۔

مذکورہ بڑھیا کی اس بات سے میں بہرحال متفق نہیں ہوں کہ شکاگو دنیا کا سب سے اچھا شہر ہے۔ امریکی خاتون کے دلائل اپنی جگہ مگر یہ دعویٰ میں اس سے پہلے کم و بیش پندرہ مختلف ملکوں کے شہروں کے بارے میں سن چکا ہوں۔ شکاگو کا موسم اچھا ہے اور عام آدمی کو دستیاب سہولیات کے اعتبار سے بھی یہ متاثر کن ہے مگر یہ سب دنیا کے تمام بڑے شہروں میں لگ بھگ ہوتا ہی ہے۔ بڑے بڑے

شہروں کی بڑی بڑی باتیں تو ہم کرتے اور سنتے رہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہمارے اس کرۂ ارض پر واقع مجموعی انسانی آبادیوں کا غالب حصہ تو وہ چھوٹی چھوٹی بستیاں اور گاؤں ہیں، جن کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔ ایک ایسی ہی دور افتادہ بستی لاس بیر دیس ہے، جس کا آج میں آپ سے تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

بحر الکاہل کے کنارے پر واقع اس بستی میں دوپہر کی دھوپ میں کھڑے ہو کر ارد گرد کے منظر کا جائزہ لیں تو ایک طرف سمندر، دوسری طرف مٹیلے پہاڑ اور درمیان میں ناہموار چٹانوں سمیت ہر چیز سبز نظر آتی ہے۔ یقیناً یہ منظر ہمیشہ سے ایسا ہی سبز ہوگا؟ جبھی تو اس بستی کو بسانے والے مچھیروں نے اس علاقے کا نام ''لاس بیر دیس'' ہسپانوی نام کو اردو میں کہیں تو ''سراپا سبز بستی'' رکھ دیا۔ ماحول کی رنگت سے منسوب یہ بستی اتنی چھوٹی ہے کہ اگر آپ نقشہ دیکھیں تو شاید اس کا نشان ہی نہ ملے۔ مگر نقشے میں کسی مقام کے عدم دستیاب ہونے سے اس کا وجود تو ختم نہیں ہو جاتا، اور نہ ہی اس سبب سے اسکی اہمیت کم ہو سکتی ہے۔ میرے لئے تو ایسے مقامات میں دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جن کا کہیں احوال ہی درج نہ ہو۔ چلی کی ریاست کا مجموعی رقبہ پندرہ ریجن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آپ انہیں پندرہ صوبے کہہ لیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ بستی پہلے ریجن میں واقع ہے جسے ''تاراپاکا'' کہا جاتا ہے۔ یہ ملک کا شمالی علاقہ ہے۔ یہاں موسم سارا سال معتدل رہتا ہے۔ گرمی زیادہ پڑتی ہے اور نہ ہی زیادہ سردی ہوتی ہے۔

لاس بیر دیس کا تعارف اگر آپ سے یوں کرواؤں تو آپ ضرور دلچسپی لیں گے کہ یہاں کتوں کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ دنیا تو بہت بڑی ہے، ہو سکتا ہے یہ دعویٰ باطل ہی ہو؟ مگر میں نے تو اس سے پہلے زندگی میں کبھی گورستانِ کلاب دیکھا ہی نہیں تھا، جو سنا تھا، وہ آپ سے عرض کر دیا ہے۔ کئی ایکڑ پر پھیلا یہ منفرد نوعیت کا گورستان اس لئے بھی اچنبھے کا باعث ہے کہ آس پاس کی آبادی تو چند گھروں پر مشتمل ہے، قبرستان کی رونق یقیناً وہ پالتو کتے ہیں جو قریبی بستیوں اور شہروں میں اپنی زندگی گزار کے آئے ہیں۔ لاس بیر دیس میں میری آمد و رفت کی وجہ قدرتی مناظر کے علاوہ اس کے ریستوران ہیں۔ ان شہرہ آفاق ریستورانوں میں تازہ سمندری خوراک

(سی فوڈ کا یہی اردو ترجمہ سمجھ میں آتا ہے) شام ڈھلے تک گاہکوں کو ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوتی ہے۔ سارا دن یہاں دور دراز کا سفر کرنے والے لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مگر اصل ہجوم یہاں چھٹی کے روز ہوتا ہے۔ سمندری مخلوق کے تناول ماحضر کے ساتھ لائیو میوزک پرفارمنس اور لائیو روایتی فوک رقص کھانے کا مزا دوبالا کیئے دیتے ہیں۔ سرائے نما ان ریستورانوں کے پہلو میں سیاحوں کے شوقِ سواری کے لئے پست قد کے گھوڑے، جنہیں ''پونی'' کہا جاتا ہے۔ کرائے پر ملتے ہیں۔ میرے ساتھ سواری کا تجربہ عجیب رنگ سے پیش آیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ اس ٹیڈی گھوڑے کی پیٹھ پر جب میں سوار ہوا تو پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے وقت یہ بڑا آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ اور خاصا شریف النفس جانور لگ رہا تھا۔ مگر جونہی واپسی اترائی کا سفر اختیار کیا، اس بدمعاش ٹیڈی گھوڑے نے وہ سپیڈ پکڑی کہ مجھے محسوس ہوا کہ اب یہ بحرالکاہل میں ڈبونے کے بعد ہی سانس لے گا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی باگیں کھینچیں مگر وہ دیوانہ وار سمندر کی طرف منہ کر کے سرپٹ دوڑتا ہی چلا جاتا تھا۔ دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ سمندر میں ڈوب کر مرنے سے بہتر ہے کہ بھاگتے گھوڑے سے چھلانگ لگا کر ایک آدھ ہڈی پسلی تڑوا کر ہی جان بخشی کروالی جائے۔ میں اپنے خیالات کو عملی شکل دینا ہی چاہتا تھا کہ ٹیڈی گھوڑا معجزانہ طور پر اپنی رفتار کم کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔

لاطینی امریکہ کے تمام ممالک میں سڑک کنارے ایک منظر مشترک نظر آتا ہے، جو کہ اس بستی کی سڑک کنارے بھی نظر آئے گا، وہ ٹریفک حادثات میں جاں بحق ہونے والے لوگوں کی جائے وفات کے قریب تعمیر کردہ یادگاریں۔ عموماً ایک مربع میٹر رقبے پر کنکریٹ سے بنی یہ یادگار دو، چار فٹ اونچی ہوتی ہے۔ ڈربہ نما اس یادگار کے اندر کبھی مرحوم کی تصویر اور اس کی پسند کی کچھ اشیاء، کہیں حضرت عیسیٰؑ اور کنواری مریمؑ کے مجسمے یا پھر دیگر مذہبی تبرکات اس کے اندر رکھے گئے ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی یادگاروں پر لکھی عبارت یکساں ہوتی ہے۔ صلیب پر کنداں ''یسوعؑ جانتا ہے''یسوع مسیحؑ کے متعلق ہی عموماً دیگر کلمات بھی درج ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک دلچسپ پہلو ہے کہ پچھلے تین سو سال سے اس بستی میں بارش نہیں برسی ہے۔ عین

ممکن ہے کہ کبھی نہ کبھی یہاں برکھا برسی ہو مگر تین صدیوں سے پرانا ریکارڈ محکمہ موسمیات کے پاس دستیاب نہیں ہے۔ بارش نہ برسنے کی وجہ کسی دیوتا کی بددعا یا بستی کے گنہگار لوگ نہیں ہیں بلکہ اس علاقے کا محلِ وقوع اس کا ذمہ دار ہے، پہاڑوں کے سبز سینے سے پھوٹنے والے زیرِ زمین سب چشمے لاس بیر دیس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور یہاں بحرالکاہل میں جا ملتے ہیں۔ ان رواں دواں چشموں کا میٹھا پانی بارش کی کمی ہرگز محسوس نہیں ہونے دیتا۔ نباتات کا اس بستی میں وجود نہیں پھر بھی ہر طرف سب کچھ سبز ہی سبز نظر آتا ہے، یہ بھی فطرت کا ایک معجزہ ہے۔

لاطینی امریکہ کی پہلی نوبیل انعام یافتہ

دنیا کے کسی بھی ملک میں داخل ہوں تو امیگریشن اور کسٹم کے بعد پہلا مرحلہ عموماً کرنسی کو مقامی سکہ رائج الوقت میں تبدیل کروانا ہوتا ہے۔ چلی میں جب مقامی کرنسی ''پیسو'' حاصل کریں تو ہر نرخ کے نوٹ پر کسی قومی ہیرو مرد کی تصویر بنی نظر آتی ہے البتہ پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ پر ایک مہربان خاتون کا چہرہ نظر آتا ہے۔ یہ نوبیل انعام یافتہ شاعرہ، سفارتکار اور ماہرِ تعلیم گبریلا مسترال ہیں۔ ہسپانوی زبان کی شاعری کو گبریلا مسترال نے ایک نیا نسوانی لہجہ عطا کیا۔ وہ اگرچہ عالمی سطح پر بطور ماہرِ تعلیم اور سفارتکار کے طور پر پہچانی جاتی تھیں، اسی حیثیت سے انہوں نے متعدد بار لیگ آف نیشنز سے بھی خطاب کیا مگر ہسپانوی ادب میں وہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ایسی آواز جو ادبی دنیا میں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے اور پھر صدیوں تک یاد رکھی جاتی ہے۔

گبریلا مسترال لاطینی امریکہ کی پہلی شخصیت تھی جسے ادب کے نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ وہ ان خوش نصیب تخلیق کاروں میں سے ایک ہیں جن کے فن کا اعتراف ان کی زندگی میں بھی کیا گیا، اور مرنے کے بعد بھی انہیں فراموش نہیں کیا گیا۔ چلی میں 1884 میں پیدا ہونے والی گبریلا مسترال کی شخصیت کے کئی پہلو غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ اس کے والدین نے پیدائش کے وقت جو اسے نام دیا وہ لوسیا وی ماریا تھا، مگر اس نے اپنے دو پسندیدہ شاعروں کے نام کے اشتراک سے اپنا قلمی نام اخذ کر لیا تھا۔ بعض مورخین کے نزدیک نام بدلنے کی وجہ اس کے محبوب کی خودکشی کا واقعہ ہے۔ اسی سبب سے جہاں مسترال کے ہاں قدرتی مناظر، محبت، بے وفائی، نسوانیت اور شفقت مادر کے موضوعات ہمیں ملتے ہیں۔ وہاں اس کے محبوب کی خودکشی کا واقعہ بھی جابجا اثر انداز ہوتا اور شعروں

میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔اس کی زندگی ابتداء سے ہی دکھوں اور مصیبتوں میں گھری ہوئی تھی۔فقط تین برس کی تھی جب والد کا انتقال ہو گیا۔ بڑی بہن نے پرورش کی ذمہ داری سنبھالی، مگر کچھ سالوں بعد وہ بھی زندگی کی بازی ہار گئی۔ ماں بیمار رہتی تھی۔ گبریلا فقط پندرہ برس کی تھی جب وہ گھر کی واحد کفیل بن گئی۔اپنی بیمار ماں کی تیمارداری کے علاوہ وہ سکول میں پڑھاتی بھی تھی۔ مالی پریشانیوں کے سبب اس نے اپنی ذاتی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی چونکہ اس کے والد اور بڑی بہن تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے، اسی لیے کم تعلیم کے باوجود اسے معلّمہ کی نوکری مل گئی۔ ویسے بھی ایک صدی پہلے کے چلی میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کی شدید کمی تھی۔مضافاتی علاقوں میں یہ کمی شدید تر تھی لہذا جو بھی خواندہ یا نیم خواند شخص تدریس کے شعبہ میں دلچسپی ظاہر کرتا اسے کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جایا کرتی تھی۔تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہو کر وہ شہروں شہروں ہجرت کرتی رہی، اس کا سبب اس کی طبیعت میں پائی جانے والی شاعرانہ بے چینی بھی تھی، شوقِ آوارگی بھی۔

پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کی پہلی ملاقات 1920ء میں چلی کے شہر تیموکو میں اس وقت ہوئی جب نرودا وہاں ہائی سکول کا طالبعلم تھا اور گبریلا مسترال اسے ایک سال پڑھاتی رہی، چونکہ وہ ایک سال کے لیے تدریس کے فرائض سرانجام دینے اس سکول میں متعین تھی۔اس تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نرودا اور مسترال میں ایک استاد اور شاگرد کا ذاتی نوعیت کا رشتہ موجود تھا، گو کہ دونوں کے شعری نظریات میں اختلاف تھا گبریلا مسترال سیاست سے دور رہنا پسند کرتی تھی، اسی لیے جب اٹلی کے مطلق العنان حکمران مسولینی نے اسے وزارت کی پیشکش کی تو اس نے لگی لپٹی کے بغیر صاف انکار کر دیا تھا۔شاعری کے میدان میں اسے پہلی کامیابی چلی کے قومی ادب ایوارڈ کی صورت میں 1914ء میں حاصل ہوئی۔اگرچہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے تک اس نے کئی یادگار نظمیں تخلیق کر ڈالی تھیں اور وہ شائع ہو کر سندِ قبولیت بھی حاصل کر چکی تھیں، مگر پہلے شعری مجموعے پر ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام ملنا قومی سطح پر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ عالمی سطح پر گبریلا مسترال کا زیادہ موثر تعارف اس وقت ہوا جب نیویارک سے 1922ء میں اس کا شعری مجموعہ ''تنہائی'' اشاعت پذیر ہوا۔اسی برس وہ میکسیکو کی

حکومت کی دعوت پر وہاں تعلیم کے شعبے میں خدمات سرانجام دینے چلی گئی۔ سفارت اور تعلیم کے شعبوں میں خدمات کے سلسلے میں وہ امریکہ اور یورپ اکثر جاتی رہتی۔ چلی سے ترک وطن کے بعد اس کی زیادہ تر زندگی خود ساختہ جلاوطنی میں گزر گئی۔ کئی سال تک وہ فرانس میں بھی مقیم رہی۔ کئی برس بعد چلی لوٹی تو سب سے بڑی یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا حالانکہ وہ بارہ سال کی تھی جب روایتی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ گبریلا مسترال کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ اپنی کئی کتابوں کی کمائی اس نے جنگ سے متاثرہ بچوں کے لیے عطیہ کر دی تھی۔ بچوں سے اس کی محبت اور مادری شفقت اس کی شاعری سے بھی چھلکتی ہے۔

1957ء میں امریکہ کے ایک شہر میں اپنی آخری سانسیں لینے والی اس عظیم نوبل انعام یافتہ شاعرہ زادی اور تہذیب کا حصول تعلیم اور خدمت کے ذریعے ہی ممکن سمجھتی تھی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی بھر آزادی اور تہذیب کی ترقی کے لیے تعلیم دینے اور انسانی خدمت کرنے کو ایک روحانی فریضہ سمجھتے ہوئے انجام دیا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسرا راستہ حیوانیت اور جنگل کی طرف انسان کو واپس لے جاتا ہے۔ انسانی جذبات کے خوبصورت اظہار کے ساتھ ساتھ لاطینی امریکہ اور یورپ کی تہذیب کے حسین امتزاج سے شعری روایت قائم کرنے والی گبریلا مسترال 67 برس کی عمر میں کینسر میں مبتلا ہو کر دنیا چھوڑ گئیں۔

دوہری شہریت کا دوسرا رخ

آج سے ٹھیک نصف صدی قبل مارشل میک لوہان نے بدلتی ہوئی دنیا کے تناظر میں ''گلوبل ویلیج'' کا نظریہ پیش کیا تھا۔اس دانشور اور ماہرِ تعلیم کا کہنا تھا کہ یہ دنیا، مواصلاتی شعبے میں ترقی کے سبب ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر رہی ہے، وہ دن دور نہیں جب یہ کرۂ ارض عملی طور پر ایک عالمگیر گاؤں بن جائے گا۔کینیڈا میں پیدا ہونے والے مارشل کو الیکٹرانک میڈیا کی دنیا میں وہی مقام حاصل ہے جو ارسطو کو سائنس میں ہے۔اس تھیوری کو سن کر ذہن میں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ''عالمی گاؤں'' کیونکر؟ دنیا کے مستقبل کے متعلق اس نے ''عالمی شہر'' کی اصطلاح کیوں استعمال نہیں کی؟ اس سوال کا جواب مارشل کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں تھا کہ، شہروں میں لوگ ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے ہوئے بھی پڑوسی کے حال سے بے خبر رہتے ہیں یا رہ سکتے ہیں۔گاؤں میں حالات بالکل مختلف ہوتے ہیں، آپ بات چھپانا بھی چاہیں تو نہیں چھپا سکتے۔صبح کے وقت وقوع پذیر ہونے والا کوئی بھی اہم واقعہ، شام تک گاؤں کے ہر فرد کے علم میں ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہر غیر اہم واقعہ بھی سورج ڈھلنے سے پہلے ہر شخص کے علم میں آجاتا ہے، چاہے کوئی بے خبر اور لاعلم ہی کیوں نہ رہنا چاہے۔

مارشل میک لوہان کی زندگی میں اس کے ''گلوبل ویلیج'' نظریے کے متعلق ماہرین عمرانیات کی رائے بٹی ہوئی تھی۔ میڈیا اور ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں اس کی شہرت، موت تک ایک متنازعہ آدمی کے طور پر رہی۔مگر آج آدھی صدی گزرنے کے بعد، نا صرف عمرانیات کے ماہر بلکہ زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم اس نقطہ پر متفق ہیں کہ یہ دنیا ایک عالمگیر گاؤں بن چکی ہے۔ یہاں مقصد مارشل کی علمی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرنا نہیں، جس نے آدھی صدی پہلے انٹرنیٹ اور سوشل

میڈیا کا تصور پیش کیا، بلکہ اس کے پیش کردہ نظریے کی روشنی میں موجودہ حالات کا جائزہ لینا ہے۔

عالمگیریت کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کوئی بھی ملک باقی دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی قوم ایسا چاہے بھی، کہ وہ باقی دنیا سے لاتعلق رہے گی، پھر بھی یہ دنیا اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ ویسے تو اب ہر ملک دنیا کے دیگر ممالک پر انحصار کرتا ہے۔ اس لیے کوئی قوم ایسا چاہے گی ہی نہیں کہ اسے دیگر اقوامِ عالم سے الگ کر دیا جائے۔ بین الاقوامی طور پر یہ بات اب تسلیم شدہ ہے کہ ''کوئی بھی ملک الگ جزیرہ نہیں ہے۔'' جزیرے سے مراد یہاں جغرافیائی معنوں میں خطۂ زمین نہیں بلکہ سماجی اعتبار سے الگ تھلگ ملت مطلب ہے۔

دوہری شہریت کے حامل افراد کو حق رائے دہی و نمائندگی دینے کے موضوع کو میں اسی تناظر میں دیکھتا ہوں۔ مختلف ممالک کی مثالوں اور بدلتے قوانین کا جائزہ پیش کر کے میں نے اپنے اخباری کالمز میں یہ رائے پیش کی تھی کہ، دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانیوں کو برابری کے حقوق ملنے چاہئیں۔

ملک میں کوئی بھی ایسا قانون نہیں ہونا چاہیے جس سے یہ تاثر قائم ہو کہ تارکینِ وطن پاکستانی، ملک کے اندر بسنے والے لوگوں سے کسی بھی اعتبار سے مختلف، یا پھر کم پاکستانی ہیں۔ حالیہ دنوں میں چونکہ اس موضوع پر پارلیمنٹ میں آئینی ترمیم بھی متوقع ہے، لہٰذا خبروں کا مقبول ترین موضوع بھی بنا ہوا ہے۔ اسی پس منظر میں اخبار نویس دوست اس مسئلے پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ بحث کا متقاضی مسئلہ ہے، جس میں ملک کے اندر اور باہر پاکستانیوں کی رائے منقسم نظر آتی ہے۔ دلیل کا جواب دلائل ہی سے ہونا چاہیے، یہی مستحسن ہے مگر کیا کیا جائے؟ کہ چند اخبار نویس دوہری شہریت کی حمایت میں لکھنے والوں کو گالی دے رہے ہیں۔ کچھ لوگ یہ فرما رہے ہیں کہ دوہری شہریت کے حامی اہلِ قلم کی حب الوطنی مشکوک ہے۔

گالی یا تہمت کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ میں تو گالی و بہتان تحریر کرنے والے لوگوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، کہ قوموں کی زندگی میں ارتقائی مراحل اسی طرح سے طے ہوا کرتے ہیں۔ ارتقاء

کے عمل میں ان لوگوں کا دم بھی غنیمت ہے کہ اس کا کوئی شارٹ کٹ ہی نہیں ہوتا۔ دوہری شہریت کی مخالفت میں دو اہم مضامین برطانیہ سے پاکستانیوں نے لکھے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ محض اتفاق ہو، دونوں نے یہ نہیں بتایا کہ کیا برطانیہ میں پارلیمنٹ کا ممبر بننے والے کو دوہری شہریت رکھنے کی اجازت ہے؟ یا کہ نہیں ہے؟ اگر پاکستان میں پیدا ہونے والے، مسلمان، گندمی رنگت کے ایشیائی اور اردو بولنے والے شخص کو یہ اجازت ہے کہ وہ برطانوی پارلیمان اور دارالامراء کا رکن بن سکتا ہے جبکہ برطانیہ کے ساتھ ساتھ اس کے پاس پاکستانی شہریت بھی موجود ہے، تو پھر ہمیں یہی شخص قابلِ قبول کیوں نہیں ہے؟ کیوں تاجِ برطانیہ کے لیے یہ شخص کوئی خطرہ نہیں ہے؟ قوم، رنگ، نسل، مذہب، زبان سب کچھ مشترک ہونے کے باوجود صرف ایک غیرملکی پاسپورٹ کے سبب یہی آدمی ہمارے لیے خطرے کا باعث کیوں ہوسکتا ہے؟

میں کچھ سال پہلے لندن کے ہاؤس آف لارڈز میں سینیٹر جہانگیر بدر کی کتاب "How to be a Leader" کی تقریب رونمائی میں مدعو تھا۔ اس تقریب کے چند مناظر میرے ذہن میں مسلسل گردش کررہے ہیں، میاں شہباز شریف اور غوث علی شاہ کے علاوہ برطانوی پارلیمنٹ کے پانچ ارکان اور دارالامراء سے لارڈ نذیر احمد اور بوٹا سنگھ موجود تھے۔ حسنِ اتفاق سے ان سب کا آبائی وطن برصغیر پاک و ہند تھا، کوئی ایک بھی رکن سفید فام نہیں تھا۔ میں برطانوی پارلیمنٹ کی بات کررہا ہوں جسے پوری دنیا کی پارلیمانوں کی ماں کہا جاتا ہے۔

ذاتی حوالے سے اتنی سی وضاحت کرتا چلوں کہ میں نے آج تک پاکستان کے علاوہ کسی بھی ملک کی شہریت کے لیے کبھی درخواست بھی نہیں دی ہے۔ گو کہ اگرچہ میں مشرقِ بعید اور لاطینی امریکہ کے ایک ملک کی شہریت کے حصول کے لیے درکار قانونی تقاضے پورا کرتا ہوں، لیکن میرا ارادہ صرف پاکستانی پاسپورٹ رکھنے کا ہے۔ مگر میں دوہری شہریت کو برا نہیں سمجھتا۔ جن پاکستانیوں نے بیرونی ممالک کے پاسپورٹ حاصل کیے ہیں، ان کی غالب اکثریت کے نزدیک اس کا مقصد فقط سفر کی سہولت اور کاروبار میں آسانی ہے۔ تارکینِ وطن کی اربوں ڈالر پر مشتمل ترسیل زر اہم معاملہ ہے، مگر

اس سے بھی زیادہ اہم بات میرے نزدیک بیرونِ ملک مقیم پاکستانی والدین کے ہاں جنم لینے والے بچے ہیں جن کے پاس دوہری شہریت ہے۔ یہ بچے اور نوجوان پاکستان کے بیرونِ ملک سفیر ہیں۔

ان کو ہرگز یہ احساس نہیں دلانا چاہیے کہ وہ کسی بھی طرح ہم سے کم پاکستانی ہیں۔ پچاسی لاکھ سمندر پار پاکستانی ہماری طاقت ہیں، کمزوری قطعی نہیں ہیں۔ دوہری شہریت رکھنے والے احباب کے باب میں ہونے والی گفتگو کے دوران جن خدشات کا ذکر کیا جارہا ہے ان کی بنیاد اب تک تو صرف مفروضوں پر ہی ہے، کہ آج تک کوئی نسلی اعتبار سے غیر ملکی تو ہماری پارلیمان کا ممبر نہیں بنا، نہ ہی مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ بالفرضِ محال مستقبل میں اگر پاکستان کے کسی شہر کے مکینوں کی غالب اکثریت کسی غیر ملکی نسل کے پاکستانی شہری کو اپنا نمائندہ بنانا چاہتی ہے! تو اس میں حرج کیا ہے؟

یاددہانی کے لیے بتاتا چلوں کہ آج کل امریکہ کے صدر کا نام بارک حسین اوبامہ ہے، جسکا والد کینیا کا سیاہ فام مسلمان تھا اور جس کی جائے پیدائش اب تک بھی متنازعہ ہے کہ وہ جزائر ہوائی میں ہوئی یا پھر کسی غیر ملک میں؟ صدر کا سوتیلا بھائی اب بھی کینیا میں، جبکہ پھوپھی غیر قانونی طور پر امریکہ میں مقیم ہے۔ کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، دنیا بھر کے ماہرینِ عمرانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنے والے دنوں میں اوبامہ جیسے، کثیر النسل کے بچے ہی اکثریت میں ہوں گے۔ اور یہی چاکلیٹ رنگ کے بچے پوری دنیا میں حکمرانی کرتے نظر آئیں گے۔ دوہری شہریت کے حامل پاکستانیوں کے حق رائے دہی و نمائندگی پر عائد پابندی ہوسکتا ہے یہی پارلیمنٹ ختم کر دے۔ اگر موجودہ پارلیمان یہ پابندی ختم نہیں کرے گی تو پھر اس سے اگلی، یا پھر اس سے اگلی اسمبلی یہ کام کر دے گی۔ پابندی تو بہر حال ختم ہونا ہی ہے۔ کیونکہ وقت کا اپنا مزاج ہے، وہ صرف آگے ہی بڑھتا ہے۔ حکیم الامتؒ یاد آگئے۔ بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ویسٹ انڈیز میں کیا دیکھا

ویسٹ انڈیز کی کرکٹ کو دیکھ کر بچپن سے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ یہ یقیناً افریقہ کا کوئی ملک ہے۔اس کی وجہ شاید ویسٹ انڈیز کے کھلاڑیوں کا رنگ وروپ اور نین، نقش تھے۔ بعدازاں پتہ چلا کہ یہ افریقہ میں نہیں بلکہ براعظم امریکہ میں وقوع پذیر ہے۔ یہ انکشاف تو میرے لئے بالکل ہی تازہ ہے کہ ویسٹ انڈیز نام کا سرے سے کوئی ملک اس کرہ ارض پر وجود نہیں رکھتا۔ یہ براعظم شمالی اور جنوبی امریکہ کے چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل علاقے کو کہا جاتا ہے،امریکی ریاست فلوریڈا کے ساحل سے لے کر جنوبی امریکہ تک پھیلا تین ہزار میل کا علاقہ جس میں تین درجن سے زیادہ جزائر پر مشتمل ممالک ہیں،ان جزائر کی مشترکہ کرکٹ ٹیم اور مرکزی کرکٹ بورڈ ہے۔تاجِ برطانیہ نے اپنے زیراثر جزائر کو ملا کر ویسٹ انڈیز کے نام سے 1960 میں ایک ریاست تشکیل دی تھی ،مگر برطانوی نوآبادیاتی عہد کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور بعدازاں اس ملک سے کئی نئے ممالک بن گئے ،مگراس کا تشکیل دیا ہوا کرکٹ بورڈ آج بھی قائم ہے، ویسٹ انڈیز کی مشترکہ کرکٹ ٹیم ہمیں نصف صدی پہلے بکھر جانے والی ریاست کی یاد بھی دلاتی ہے۔اس کا کرکٹ بورڈ اور کرکٹ ٹیم ابھی تک بھرپور انداز میں قائم ہے۔چار جزائر یہاں اب بھی برطانیہ کے قبضے میں ہیں۔فرانس اور ہسپانیہ کے بھی بہت سارے جزائر تھے، بلکہ سب سے پہلے تو یہاں ہسپانوی ہی لنگرانداز ہوئے تھے۔

کرسٹوفر کولمبس جس نے امریکہ دریافت کر کے دائمی شہرت پائی ،وہ پہلے 1492 میں ویسٹ انڈیز کے جزیرے بھاماس پر ہی لنگرانداز ہوا تھا۔جب امریکہ کی دریافت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ریاست ہائے متحدہ امریکہ نہیں ہوتا،کولمبس وہ پہلا یورپی باشندہ تھا جس نے امریکی براعظم پر قدم

رکھے،اور یہ زمین ویسٹ انڈیز کی تھی ۔ یہاں یہ تذکرہ کرتا چلوں کہ کولمبس کا تعلق سپین سے تھا۔ برطانیہ اورفرانس کے بعد ولندیزی اور ڈنمارک کے مہم جو اس سرزمین پر پہنچے تھے۔ڈنمارک نے اپنے زیرتسلط جزائر 1916 میں پچیس ملین ڈالر کے قلیل سرمائے کے عوض امریکہ بہادر کوفروخت کردیئے تھے۔ جنہیں اب بھی ہم ورجن آئی لینڈ کے نام سے پہچانتے ہیں۔ہم سے نسبت یوں بھی خصوصی ہے کہ یورپ کے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کے جنوبی ایشیاء میں واقع جزائر اور ہندوستان سے تفریق پیدا کرنے کے لئے امریکہ کے ان جزائر کو ویسٹ انڈیز کا نام دیا تھا۔ویسے اس خطے کو کریبیا اور کریبین بھی کہا جاتا ہے۔سرسبز جزیروں کا جھرمٹ۔

صبح کا سورج پاناما میں دیکھا اور شام ہونے کو تھی جب کرکٹ کے مرکز ترینی داد اور ٹوباگو پہنچا۔ پاکستان کے لوگ یہاں بغیر ویزے کے آجا سکتے ہیں۔ائیرپورٹ پر امیگریشن عملہ بڑے دوستانہ انداز میں پیش آتا ہے۔میرے خیال میں چند منٹ سے زیادہ وقت سوال وجواب میں نہیں لگا اور میرے پاکستانی پاسپورٹ پرانھوں نے اپنے ملک کی انٹری کا ٹھپہ لگا دیا تھا۔ لوگوں سے گلی، بازاروں میں بات کرنا بہت آسان ہے۔ برطانوی نوآبادیاتی ہونے کے سبب سبھی لوگ انگریزی میں بات کرتے ہیں اور ہر شخص کرکٹ میں دلچسپی رکھتا ہے۔جس کے ساتھ بات کرنے کا بہانہ نہ مل رہا ہو اس سے بے دھڑک کرکٹ پر بات شروع کردیں۔مکالمہ شروع ہو جائے گا۔ابھی ابھی ایک بوڑھا مجھ سے حنیف محمد اور حفیظ کاردار کی تعریف کر رہا تھا، ماجد خان کے کیرئیر کا بھی جائزہ اس نے تفصیلی پیش کیا، حالانکہ یہ میری پیدائش سے پہلے کے واقعات ہیں، مگر میں نے بوڑھے کا دل نہیں توڑا اور دلچسپی سے باتیں سنتا رہا۔

ایک لطیفہ نما واقعہ یہ ہوا کہ، میری میزبان کے چرب زبان خاوند سے جب کرکٹ کے موضوع پر بات ہو رہی تھی تو اس نے بتایا کہ میرے ہوٹل کے پچھواڑے پہاڑی پر برائن لارا کا گھر ہے۔ میں نے اسے سچ سچ بتا دیا کہ میں لارا کو بہت پسند کرتا ہوں۔ برائن لارا جیسے بلے باز دہائیوں بعد پیدا ہوتے ہیں ۔میری بات کو سن کر کولن نامی یہ تازہ دوست کمال بے نیازی سے کہنے لگا کہ اگر ایسی بات ہے تو میں تمہا

ری اس سے ملاقات کروادیتا ہوں ۔ظاہر ہے، میں نے فوراًہی آمادگی ظاہر کردی۔کولن کہنے لگا کہ آج تو دیر ہوگئی ہے،کل شام چھ بجے تیار رہنا۔اگلے روز وقت مقررہ پر میں تیار ہو چکا تھا اور وہ بھی عین وقت کیمطابق مجھے لینے کے لیے ہوٹل کی لابی میں پہنچ گیا۔گاڑی کی اگلی نشست پر میں اس کے برابر بیٹھا اور ایک ، دو منٹ بعد ہی ہم پچھلی سڑک کے کنارے واقع پہاڑی کی چوٹی پر برائن لارا کے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔گھر کیا تھا، بالکل قلعہ نما تھا۔اپنے لاہور کے گورنر ہاؤس سے ملتی جلتی عمارت ہے۔کولن نامی یہ باتونی شاہ کالا بتانے لگا کہ برائن لارا اکثر یہاں پارٹی کرتا رہتا ہے اور اس کی پارٹی میں شرکت کی داخلہ فیس عموماً سات، آٹھ سوڈالر ہوتی ہے۔مگر جتنے اچھے انتظامات اور انواع واقسام کے مشروبات پیش کیے جاتے ہیں۔یہ سات، آٹھ سوڈالر بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتے ہیں۔اتنے میں سیکیورٹی گارڈ کی گیٹ کے ساتھ نصب سپیکر سے آواز برآمد ہوئی کہ کیا چاہیے؟ کولن نے گول مول سی بات کی اور فوراًہی گیٹ کھل گیا، گارڈ برآمد ہوا تو اس کے ساتھ نہ جانے کیا گٹ مٹ ہوئی، وہ ہم دونوں کو گھر کے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ابھی ہم دونوں صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک باکسر ٹائپ نوجوان، سیاہ سوٹ، ٹائی میں ملبوس عقبی دروازے سے برآمد ہوا اور ہم سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا کہ کیسے آنا ہوا؟

میری میزبان کا خاوند اس سے مخاطب ہوا کہ جناب! میرے ساتھ جو صاحب تشریف لائے ہیں یہ سچن ٹنڈولکر کے کزن ہیں، اور برائن لارا سے ملنا چاہتے ہیں۔سوٹ میں ملبوس آدمی نے کہا کہ میں لارا کا منیجر ہوں، وہ اس وقت تو گھر پر نہیں ہیں، اگر ہوتے تو آپ سے مل کر بے حد خوشی محسوس کرتے مگر انہوں نے آپ کی آمد کا ذکر نہیں کیا؟ میں گنگ بیٹھا، حیرت اور پریشانی کے ملے، جلے جذبات کے ساتھ کوئی مناسب جواب ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کولن نے اپنی قینچی جیسی زبان چلائی، کہ دراصل یہ برائن لارا کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔منیجر کہنے لگا کہ میں آپ کی ملاقات کا وقت طے کر دیتا ہوں، آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟ کافی پی کر جایئے گا۔اس دوران میں کولن سے آنکھوں ہی آنکھوں میں التجائیں کر رہا تھا کہ ''نکلو یہاں سے'' کافی کی دعوت میں نے فوراًہی رد کرتے ہوئے کہا کہ ابھی میں کچھ دن

یہاں قیام کروں گا۔ ہم دوبارہ حاضر ہوں گے، پھر آپ سے کافی پیئں گے، یہ ادھار رہا۔ تقریباً گھسیٹتے ہوئے میں نے کولن کو صوفے سے اٹھایا اور تیز قدموں کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئے۔ باہر نکلتے ہی میں نے اس کی کلاس لینا شروع کر دی۔ کولن کہنے لگا یار! تمہاری شکل تو سچن ٹنڈولکر سے بہت ملتی ہے، اور سچن ٹنڈولکر کا برائن لارا بڑا گہرا دوست ہے یقین کرو اگر وہ مل جاتا تو ہماری بڑی خاطر مدارت کرتا۔

ویسٹ انڈیز میں برصغیر پاک و ہند اور افریقی نسل کے والدین کے باہمی امتزاج سے پیدا ہونے والی اولاد کو ''دوغلا'' کہتے ہیں۔ ترینی داد اور ٹوباگو کی آبادی کا یہ دس فیصد ہیں۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہونے والوں کی تعداد آبادی کا 35 فیصد ہے اور یہی شرح افریقی نسل کے لوگوں کی ہے۔ دیگر نسلوں کے لوگ بیس فیصد ہوں گے۔ ویسٹ انڈیز کے زیادہ تر ممالک میں یہی شرح اور تناسب پایا جاتا ہے۔ لفظ ''دوغلا'' سن کر پہلی بار تو مجھے جھٹکا لگا۔ یقیناً ہماری ثقافت میں یہ ایک منفی اظہار یہ ہے مگر جب میری ڈرائیور لینیٹ نے اپنے شوہر کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے مجھے بتایا کہ یہ میرا ''دوغلا'' ہے چونکہ ان کے والدین ہندوستانی اور افریقی مکس نسل کے ہیں تو میرے نزدیک اس لفظ کے معنی ہی بدل گئے۔ یہاں کا مقبول میوزک ''چٹنی'' ہے یہ وہ گیت ہے جس کا سازینہ اور گانے کا انداز تو برصغیر کی موسیقی جیسا ہے، ترنم اور سرُ اردو گانوں جیسا مگر بول انگریزی کے ہوتے ہیں۔ افریقی روایتی موسیقی ''سوکا'' بھی یہاں مقبول ہے اور آجکل چٹنی اور سوکا میوزک کا فیوژن بہت ہٹ چل رہا ہے۔

محبت کے دو رنگ

بنیادی طور پر تو یہ پیش لفظ ہے جو میں دو نوبل انعام یافتہ شعراء کے کلام کے تراجم پیش کرتے ہوئے بطور مترجم تحریر کیا تھا، چونکہ دونو شعراء کا تعلق بھی لاطینی امریکہ سے ہے اور نفس مضمون بھی کتاب سے مطابقت رکھتا ہے،اس لئے بغیر کسی تبدیلی کے من وعن پیش کر رہا ہوں۔البتہ تراجم پڑھنے کے لئے آپ کو متذکرہ کتاب پڑھنا پڑے گی۔پچھلی ایک صدی میں اس کرۂ ارض پر اس کتاب میں شامل نظموں جیسی بہت کم نظمیں کہی گئی ہیں۔ "محبت کے دو رنگ۔گبریلا مسترال اور پابلو نرودا" میں ایک رنگ عورت کی محبت کا ہے تو دوسرا مرد کی محبت کا۔گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی زندگی میں کئی چیزیں مشترک ہیں جیسے دونوں کا تعلق جنوبی امریکہ کے ملک چلّی سے ہے دونوں ادب کے نوبل انعام یافتہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب سفارتکار بھی تھے۔گو کہ دونوں کا نظریہ سیاست کے متعلق بہت حد تک متضاد تھا۔پابلو نرودا کیمونسٹ پارٹی کے نہ صرف سربراہ رہے بلکہ پارٹی کی طرف سے ملک کے صدر کے عہدے کے لئے امیدوار بھی منتخب ہوئے جبکہ گبریلا مسترال سیاست سے دور رہنا پسند کرتی تھی۔جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب اٹلی کے مطلق العنان حکمران مسولینی نے اسے وزارت کی پیشکش کی تو اس نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔تاہم مسترال اور نرودا کی شاعری میں محبت کا رنگ الگ الگ ہونے کے باوجود ایک چیز مشترک ہے کہ دونوں کے رنگ سچے اور سُچّے ہیں۔مجھے لگتا ہے بلّھے شاہ نے انہی کے لئے کہا تھا۔" جو رنگ رنگیا گوڑھا رنگیا" اسی لئے میں اس کتاب کا نام بھی بلّھے شاہ سے ہی مستعار لے رہا ہوں۔

1920 میں پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کی پہلی ملاقات ہوئی جب چلّی کے شہر

تیموکو میں نرودا ہائی سکول کا طالب علم تھا اور مسترال اس سکول میں ایک سال سے زیادہ عرصہ پڑھاتی رہی۔ اس لحاظ سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کا نہ صرف عہد ایک تھا بلکہ استاد اور شاگرد والا خوبصورت ذاتی نوعیت کا باہمی تعلق بھی موجود تھا۔

گبریلا مسترال کی شاعری کا اردو زبان میں یہ پہلا ترجمہ ہے اور پابلو نرودا کی نظموں کا بھی اس لحاظ سے پہلا ترجمہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے ترجمہ ہونے والی نظمیں انگریزی ترجمے سے ترجمہ کی گئی ہیں اور تعداد میں بھی بہت قلیل ہیں جبکہ اس کتاب میں میں نے ہسپانوی زبان میں ان شعراء کے اصل متن سے ترجمہ کیا ہے۔ ویسے تو شاعری کا ترجمہ جتنا بھی خوبصورت ہو اس میں اصل زبان والی چاشنی اور موسیقیت نہیں ہو سکتی مگر جب ترجمے کو ترجمہ کیا جائے پھر تو رہی سہی کسر بھی نکل جاتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی خوبصورت منظر کی تصویر کشی کی جائے اور پھر اس تصویر سے تصویر بنائی جائے اس کے باوجود پابلو نرودا کی شاعری کے تراجم کرنے والے لوگ قابلِ قدر ہیں کہ انہوں نے اس عظیم شاعر کی شاعری کا کم از کم مرکزی خیال تو اردو قارئین تک پہنچانے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی زبان کی شاعری کا ترجمہ کرنے والے شخص کا خود شاعر ہونا ضروری ہے کیونکہ شعر کی موسیقیت کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا تبھی ممکن ہے جب شعریت کا ادراک ہو۔ اور طبیعت میں موزونیت کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے شاعر دوست جاوید شاہین مرحوم کے تراجم سب سے بہتر ہیں مگر انہوں نے بھی پابلو نرودا کی صرف چھ نظموں کا ترجمہ کیا تھا اور وہ بھی انگریزی متن سے۔

گبریلا مسترال 1889 میں پیدا ہوئی تو اس کے والدین نے اسے جو نام دیا وہ لوسیا دی ماریا تھا۔ لاطینی امریکہ کی یہ پہلی شخصیت جسے 1945 میں ادب کا نوبل انعام ملا، اسکے قلمی نام کی کہانی بھی اس کی شخصیت کی طرح دلچسپ ہے۔ پچیس سال کی عمر میں اس نے اپنے دو پسندیدہ شاعروں کے نام گبریل دی انیسو (Gabriele De Anunczio) اور فریڈرک مسترال (Frederic Mistral) سے اپنا قلمی نام گبریلا مسترال اخذ کیا۔ نام کی تبدیلی یا قلمی نام رکھنا اہل قلم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مگر مسترال

کے واقعے میں اسکی اہمیت اس لئے بنتی ہے کہ 1909 میں اس کا عاشق جو ریلوے کا ملازم تھا اور عمر میں اس سے بڑا تھا، خودکشی کر کے اسے داغ مفارقت دے گیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ گبریلا مسترال کے نام کی تبدیلی کی وجہ یہی واقعہ بنا کیونکہ خودکشی کرنے والے رومیلیو اوریتا کو وہ اپنی پہلی محبت قرار دیتی ہے۔ اس کی شاعری میں ہمیں جہاں بنیادی طور پر محبت، بے وفائی، قدرتی مناظر، غم، ماں کی محبت اور سفر کے مضامین ملتے ہیں وہیں اسکے محبوب کی خودکشی کا واقعہ بھی جابجا اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ تعلیم مکمل کئے بغیر گبریلا مسترال نے تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ تدریس کا شعبہ اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کا باپ اور بہن بھی چونکہ سکول میں بچوں کو پڑھاتے تھے اس لئے پڑھانا اس کے گھر کی روایت بھی تھی۔ اس نے چھوٹی عمر میں ہی بڑے بڑے غم اٹھائے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ تین برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسکے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش بڑی بہن کے ہاتھوں ہوئی مگر جلد ہی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ ابتدائی زندگی کے ایام شدید کسمپرسی کے تھے۔ افلاس سے مسترال کیسے نبرد آزما تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ وہ صرف پندرہ سال کی تھی جب وہ نہ صرف اپنا بوجھ اٹھا رہی تھی بلکہ اپنی بیمار ماں کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھی اور گھر کی واحد کفیل تھی۔ مالی پریشانیوں کے سبب ہی اس نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کی بڑی بہن نے اسے اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری کوشش کر کے دلوا دی تھی۔

ویسے بھی بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی کے دوران چلی میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کی شدید کمی تھی اور مضافاتی علاقوں میں تو اساتذہ کی یہ کمی شدید تر تھی۔ اس لئے جو کوئی بھی پڑھانے کے لئے نوکری تلاش کرتا، اسکی تعلیمی قابلیت اور تجربے کی کمی اس کے لئے رکاوٹ نہ بنتی تھی اور اسے کسی نہ کسی سکول میں نوکری مل ہی جاتی تھی۔ فنکاروں میں بالعموم اور شاعروں کی طبیعت میں بالخصوص جو بے چینی پائی جاتی ہے وہ بے چینی مسترال میں بھی موجود تھی جس کا واضع ثبوت یہ ہے کہ 1906 سے لیکر 1912 تک کے عرصے میں اس نے تین مختلف شہروں میں رہائش اختیار کی گو کہ وہاں بھی پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ لاسرینا، آنتافوگاستا اور لاس آندیس میں قیام کے دوران سنتیا گو بھی وہ مسلسل آتی جاتی رہتی تھی۔ 1918 میں اسے "پونتا ارینا" کے ایک سکول کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا اور 1920 میں وہ تیموکو کے سکول

میں پڑھانے لگی جہاں اسکی پابلونرودا سے پہلی ملاقات بھی ہوئی۔اگلے سال اسے سنتیا گو کے ایک سکول کا سربراہ مقرر کرنے پر ایک تنازعہ کھڑا ہوگیا۔اعلٰی طبقے کی لڑکیوں کے اس سکول میں تعیناتی کا تنازعہ بڑھتا ہی چلا گیا تو مسترال نے دل برداشتہ ہوکر 1922 میں میکسیکو کی وزارت تعلیم کی طرف سے ماہر تعلیم کے عہدے کی پیشکش قبول کرلی اور چلی کو خیرباد کہہ دیا۔اسی سال نیویارک سے اسکی کتاب "تنہائی" شائع ہوئی جس نے گبریلا مسترال کا عالمی سطح پر زیادہ موثر انداز میں تعارف کروادیا۔

شاعری کے میدان میں اسے پہلی بڑی کامیابی 1914 میں ملی جب چلّی کے قومی ادب ایوارڈ سے اسے نوازا گیا۔یوں تو پندرہ سال کی عمر میں ہی اس نے کئی یاد رہنے والی نظمیں تخلیق کردی تھیں اور وہ شائع ہوکر سند قبول بھی حاصل کرچکی تھیں مگر اتنی چھوٹی عمر میں "مردے کی ہڈیاں" کے نام سے مجموعہ کلام کی اشاعت پر ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز حاصل کرلینا اس کی اعلٰی تخلیقی صلاحیتوں کی دلیل ہے۔یاد رہے کہ میکسیکو میں قیام کے دوران اس کا امریکہ بھی کافی آنا جانا رہا اور واشنگٹن میں اس نے پین امریکن یونین سے بھی خطاب کیا۔یورپ بھی اس کی محبوب منزل تھا،اور سپین سے اس کو خصوصی لگاؤ تھا شاید اسی سبب سے اگلے شعری مجموعے کی اشاعت بھی سپین میں ہی ہوئی۔ 1925 میں وہ چلی واپس لوٹ آئی اور تدریس کے شعبے سے اس نے ریٹائرمنٹ اختیار کرلی۔گو کہ مسترال بارہ برس کی بھی نہیں تھی جب اس نے روایتی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا مگر وطن واپسی پر یونیورسٹی آف چلّی نے اسے اعزازی پروفیسر کے عہدے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔اسی سال لیگ آف نیشنز نے اسے خطاب کی دعوت دی جسے اس نے قبول بھی کیا۔1926 میں وہ فرانس منتقل ہوگئی اور پھر باقی کی زندگی اس نے خودساختہ جلاوطنی میں ہی گزاری۔اس دوران اس کا اٹلی میں بھی قیام رہا جہاں مسولینی حکمران تھا۔جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مسولینی نے اسے وزارت کی پیشکش کی تھی جسے اس نے ٹھکرادیا تھا۔اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ فسطائیت کے خلاف تھی مگر وہ کیمونسٹ بہرحال نہیں تھی۔مسترال کی زندگی ہمیں سیاست سے کتراتی نظر آتی ہے۔اس کی خودساختہ جلاوطنی کی وجہ شاعرانہ بےچینی والا ابالی پن کے علاوہ سیاست سے دور رہنے کی خواہش بھی ہوسکتی ہے۔باوصف

اس کے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتی تھی اپنی کتاب "TALA" کی تمام کمائی اس نے سپین کی خانہ جنگی میں یتیم ہونے والے بچوں کے نام کر دی تھی ۔بچوں سے اسے خصوصی محبت تھی جس کا اظہار اس کے اپنے الفاظ میں ہوتا ہے "اُس کا نام آج ہے۔ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمے دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو نظر انداز کر رکھا ہے،زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے۔بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے،انتظار کر سکتی ہیں۔مگر بچے انتظار نہیں کر سکتے ہیں۔یہی وقت ہے جب اس کی ہڈیاں بن رہی ہیں،اس کا خون بن رہا ہوتا ہے اور اس کے حواس خمسہ تشکیل پا رہے ہیں۔اس کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ " کل" کیونکہ اس کا نام " آج" ہے۔اپنی عمر کا آخری حصہ اس نے امریکہ میں گزارا۔ 1957 میں جب وہ دنیا سے رخصت ہوئی تو اس کی عمر 67 برس تھی۔

گبریلا مسترال آزادی اور تہذیب کا حصول تعلیم اور خدمت کے ذریعے ہی ممکن سمجھتی تھی اور اسی مقصد کے لئے اس نے شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی بھر آزادی اور تہذیب کی ترویج کے لئے تعلیم دینے اور خدمت کے کام کرنے کو ایک روحانی فریضہ سمجھا اور ہمیشہ یہی سمجھا کہ دوسرا راستہ حیوانیت اور جنگل کی طرف واپس لے جاتا ہے۔

چلّی میں پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کے چاہنے والے عام زندگی میں عموماً متضاد قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔سیدھی بات کروں تو نرودا کا حلقہ اثر زیادہ تر سوشلسٹ ،بائیں بازو یا پھر ترقی پسند سوچ رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے جبکہ مسترال روایتی اشرافیہ،سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی جمہوریت کے حامی لوگوں میں زیادہ مقبول ہیں۔لاطینی امریکہ میں اگر آپ کسی پڑھے لکھے شخص کے سیاسی نظریات جاننا چاہیں اور براہ راست سیاست پر سوال بھی نہ کرنا چاہتے ہوں تو اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صرف یہ پوچھ لیجئے کہ اس شخص کو گبریلا مسترال اور پابلو نرودا میں سے کون سا شاعر زیادہ پسند ہے؟اگر جواباً نرودا کا نام آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ شخص ترقی پسند ہے اور مسترال کو پسند کرنے والا آدمی امید ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہوگا یا کم از کم سوشلسٹ تو ہرگز نہیں ہوگا۔

پابلو نرودا کی پیدائش 1904 میں چلی کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے شہر پارال

میں ہوئی۔اس کی عمر فقط دو ماہ تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا جس کے بعد اس کے والد نے دوسری شادی کر لی جس میں سے اس کا ایک سوتیلا بھائی اور ایک بہن پیدا ہوئی۔ابتدائی تعلیم اس نے اپنے آبائی شہر میں ہی حاصل کی اور مزید تعلیم کے حصول کے لئے وہ سنتیا گو منتقل ہو گیا۔وہ صرف دس سال کا تھا جب اس کی پہلی نظم شائع ہوئی اور اپنی عمر کے بیس سال مکمل کرنے سے پہلے وہ عالمی سطح پر ایک مقبول شاعر بن چکا تھا۔نرودا کے والد نے ہمیشہ اس کے لکھنے کے کام کی مخالفت کی اور اسے نصابی پڑھائی پر توجہ دینے کے لئے کہتا رہا مگر کئی دوسرے لوگوں نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جن میں گبریلا مسترال بھی شامل تھی۔سولہ برس کی عمر میں جب اس نے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا تو اس کا ایک مقصد اپنے والد کو غچہ دینا بھی تھا۔یاد رہے کہ نرودا کا اصل نام نیفتالی باسو آلتو تھا۔انیس برس کی عمر میں اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہو گیا تھا اور وہ تب بیس برس کا تھا جب اس کی نظموں کا عہد ساز مجموعہ "محبت کی بیس نظمیں" اشاعت پذیر ہوا، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں اس کی کاپیاں فروخت ہوئیں۔مگر غربت نے اس کا ابھی تک پیچھا نہ چھوڑا تھا حالانکہ وہ عالمی سطح پر مانا ہوا شاعر اور ادیب بن چکا تھا۔معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ہی اس نے بحثیت سفارتکار نوکری اختیار کر لی اور رنگون، کولمبو اور جاوا کے علاوہ سنگاپور متعین رہا۔اسی دوران اس نے ایک جرمن خاتون سے شادی کر لی جو بنک میں ملازمت کرتی تھی۔

1971 میں ادب کا نوبیل انعام پانے والے نرودا کے متعلق کولمبیا کے معروف صحافی اور ناول نگار گارشیا مارکیز جو کہ خود بھی نوبیل انعام یافتہ تھا کہا کرتا تھا کہ "بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں وہ سب سے بڑا شاعر تھا"، یہاں مسترال اور نرودا کی شخصیت کا ایک اور مشترک پہلو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ مسترال کی طرح نرودا نے بھی اپنا قلمی نام اپنے پسندیدہ شاعر کے نام سے اخذ کیا تھا۔ چیک ریپبلک سے تعلق رکھنے والے شاعر جان نرودا سے وہ اتنا متاثر تھا کہ اپنے یورپ کے دورے کے دوران وہ خصوصی طور پر چیکوسلواکیہ گیا تھا تا کہ اس شاعر کی قبر پر پھول چڑھا سکے۔یہ ایک الگ یادگار داستان ہے مگر اس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

ایشیائی ممالک میں سفارتکاری سرانجام دے کر وہ واپس چلّی لوٹا تو اسے پہلے بیونس آئرس اور پھر بارسلونا میں سفارتی عہدوں پر تعینات کیا گیا۔ بعدازاں وہ گبریلا مسترال کی جگہ میڈرڈ میں چلّی کا قونصلیٹ مقرر رہوا۔ اس کی بیٹی مالوا مرینا کی پیدائش 1934 میں میڈرڈ میں ہی ہوئی جو اپنی مختصر سی آٹھ سالہ زندگی میں اکثر بیمار ہی رہی۔ اسی دوران سپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہاں اس کا حلقۂ احباب زیادہ تر ترقی پسند سوچ کے حامل دانشوروں اور مصنفین پر مشتمل تھا۔ نرودا کے کیمونسٹ خیالات انہی دنوں ترتیب پائے اور جب سپین کے آمر جنرل فرانکو نے اس کے ادیب دوست گارسیا لورکا کو قتل کروا دیا تو اس کے نظریات کیمونزم کے متعلق مزید پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر گئے اور وہ کھل کر جنرل فرانکو کے خلاف سوشلسٹوں کی حمایت کرنے لگا جس پر اسے نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ انہی دنوں اس کی جرمن بیوی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ 1938 میں مگر سپین میں اس کے دوست الیکشن جیت کر برسراقتدار آ گئے اور اسے فرانس میں ہسپانوی مہاجرین کا مشیر مقرر کر دیا گیا جس عہدے کے متعلق نرودا کا کہنا تھا کہ "میری زندگی میں یہ سب سے مقدس مشن تھا جسے میں نے قبول کیا"

1943-1940 میں وہ میکسیکو میں چلّی کا سفیر تعینات رہا۔ یہاں اس کی دوسری شادی ہوئی اور اپنی بیٹی کی موت کی اطلاع بھی اسے یہیں موصول ہوئی۔ اسی دوران اسٹالن حکومت کے مخالف لیون ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ ہوا جو ان دنوں میکسیکو میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ نرودا پر الزام ہے کہ وہ اسٹالن حکومت کا حامی تھا اور اس نے ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کو نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ ان کو چلّی کے ویزے جاری کر کے ملک سے فرار بھی کروایا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنگ عظیم دوم میں نازی جرمنی کی شکست میں اسٹالن کے کردار کی وجہ سے پابلو نرودا اس کا مداح تھا۔ 1953 میں نرودا کو اسٹالن امن انعام سے بھی نوازا گیا اور اسٹالن کی موت پر اس نے اسٹالن کے لئے ایک طویل مرثیہ لکھا تھا مگر ٹراٹسکی پر حملے میں ملوث ہونے کے الزام کی نرودا نے ہمیشہ تردید کی۔ ویزوں کے اجراء کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ ایسا میکسیکو کے صدر کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پابلو نرودا کی کردارکشی

کے لئے امریکی سی آئی اے نے باقاعدہ ایک سیل قائم کیا تھااور یہ کوئی افواہ یا پراپیگنڈا نہیں بلکہ اب امریکی حکومت سرکاری طور پر بھی اس خصوصی سیل کے وجود کی تصدیق کرتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ نرودا کے اوپر عائد یہ الزام اوراس طرح کے کئی دوسرے الزامات حقیقت میں امریکی سی آئی اے کے تراشے ہوئے افسانے ہی ہوں۔ بالشویک انقلاب روس کے ہیرو ٹراٹسکی کی آپ بیتی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے اس میں بھی کہیں نرودا کے کسی ایسے فعل میں ملوث ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے۔

1945 میں وہ سینیٹر منتخب ہوااوراس کے بعد اس نے باقاعدہ طور پر کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وہ آنتافوگاستا سے پہلے سینیٹر منتخب ہوااور کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت اس کے بعد اختیار کی۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ چلّی میں سینیٹر براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، پاکستان کی طرح بالواسطہ انتخاب کی بجائے سینیٹرز کا انتخاب امریکی طرز پر ہوتا ہے جس میں انتخابی حلقوں کی بنیاد پر حلقے کے لوگ انہیں منتخب کرتے ہیں۔

اسی سال وہ پیرو کے دورے پر بھی گیا جہاں اس نے لازوال نظم "ماچوپیچو کی بلندیاں" تحریر کی۔ یہ نظم انتہائی طویل ہے جس کے بارہ حصے ہیں جن میں سے آخری حصہ ترجمہ کر کے اس کتاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ میساچیوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ پروفیسر مارٹن کا کہنا تھا کہ "ماچوپیچو کی بلندیاں" انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم ہے۔

1946 میں نرودا کو صدارت کے لئے کیمونسٹ امیدوار کی سیاسی مہم کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ 1948 میں کیمونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی اوراس نے روپوشی اختیار کر لی۔ روپوشی کے دوران وہ تیرہ ماہ تک مختلف شہروں میں اپنے دوستوں کے گھروں اور تہہ خانوں میں چھپتا رہا کیونکہ حکومت کے کارندے اسے گرفتار کرنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہے تھے۔ ایک سال سے زائد عرصہ کی یہ روپوشی اس طرح ختم ہوئی کہ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر ارجنٹائن فرار ہو گیا۔ یہ سارا واقعہ نرودا نے نوبیل انعام وصول کرتے وقت اپنی نوبیل تقریر میں دہرایا تھا۔ اگلے تین سال اس نے جلاوطنی میں گزارے۔

ارجنٹائن میں وہ اپنے ہم شکل ناول نگار دوست میگل، جسے بعدازاں ادب کا نوبیل انعام بھی ملا، اس کے پاسپورٹ پر پورا یورپ گھومتا رہا۔اسی دوران اس نے چین، ہندوستان، روس اور سری لنکا کے دورے بھی کئے۔میکسیکو میں قیام کے دوران اس کو وہاں کی حکومت نے شہریت دے دی۔اس کے بعد 1952 میں وہ اٹلی کے جزیرے کیپری میں اپنے ایک مورخ دوست کے ہاں رہائش پذیر رہا ،نردوا کا یہ مختصر قیام بہت یادگار رہا جس پر 1965 میں ناول بھی لکھا گیا اور اس ناول پر بعدازاں 1994 میں فلم بنائی گئی۔"IL POSTINO" کے نام سے بننے والی یہ فلم جسے انگریزی میں "The Post Man" کے نام سے ڈب کیا گیا ہے، ہمیشہ یاد رکھی جانے والی فلموں میں سے ایک ہے۔1953 میں وہ واپس وطن پہنچا اور پھر اپنی موت تک زیادہ عرصہ وہیں قیام پذیر رہا۔اس میں سے صرف وہی عرصہ اس نے ملک سے باہر گزارا جب 1973-1970 میں اسے پیرس میں سفیر مقرر کیا گیا۔1969 میں اسے کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے ملک کی صدارت کا امیدوار منتخب کیا گیا مگر وہ اپنے دیرینہ دوست سالوادور آیندے کے حق میں دستبردار ہو گیا۔فرانس میں سفیر کا عہدہ بھی اس نے آیندے کے کہنے پر قبول کیا تھا، جو انتخابات میں کامیاب ہو کر چلّی کا صدر بن چکا تھا۔مگر وہ زیادہ عرصہ اس عہدے پر براجمان نہ رہ سکا۔امریکی سی آئی اے نے چلی کے فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر 1973 میں منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا تاکہ کیمونزم کا راستہ روکا جاسکے۔اس آپریشن میں امریکی لڑاکا طیاروں اور اس کے فوجیوں نے باقاعدہ طور پر حصہ لیا تھا۔جنرل پنوچے نے فوجی بغاوت کی قیادت کی جس دوران منتخب صدر آیندے کو گولیاں مار کر قتل کر کے نامعلوم مقام پر دفن کر دیا گیا۔یاد رہے کہ یہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا اور امریکہ ان دنوں دائیں بازو کے حامی ہر فوجی آمر کا کھل کر ساتھ دے رہا تھا۔11 ستمبر 1973 کو جب مارشل لاء نافذ کیا گیا تو اس سے صرف تین دن پہلے پابلو نرودا کینسر کے علاج کی غرض سے ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔فوجی بغاوت کے دس دن بعد مشکوک حالات میں اس کا انتقال ہو گیا۔سرکاری طور پر کہا گیا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے مگر لوگوں کی اکثریت کا ماننا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ویسے بھی وہ کینسر کے مرض کے علاج کے لئے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا مگر اس کے

انتقال کی وجہ ہارٹ اٹیک بتائی گئی جو کہ غیر منطقی سی بات لگتی ہے۔

2011 میں چلّی کی ایک عدالت نے پابلونرودا کی موت کا سبب جاننے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا تھا جس کی تحقیقات ابھی تک جاری ہیں۔جنرل پنوچے نے اس کے جنازے کو عوامی اجتماع میں تبدیل ہونے پر پابندی لگا دی تھی۔شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا مگر ملک کے طول وعرض سے ہزاروں افراد نے کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سنتیا گو کی گلیوں اور بازاروں کو کھچا کھچ بھر دیا تھا۔اپنی موت سے صرف ایک مہینہ قبل اس نے اپنی یادداشتیں مکمل کی تھیں جسے اس کی بیوی متلدے چھپا کر ملک سے باہر لے جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔یہ یادداشتیں دنیا کی کئی زبانوں میں بشمول اردو ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔نرودا کو اس کے ازلا نیگرا میں ساحل پر واقع گھر کے باہر دفن کیا گیا اور اس کی بیوی متلدے بھی اس کے ساتھ ہی مدفون ہے۔اس کا یہ گھر بھی باقی دو گھروں کی طرح اب میوزیم میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔ان شعراء سے میرا تعارف چلی میں ایک ہی دن ہوا تھا۔جب میں سن ۲۰۰۰ ء میں پاکستان سے ایم بی اے مکمل کر کے بسلسلہ کاروبار وہاں پہنچا تھا۔پابلونرودا کا پورٹریٹ ایک کتابوں کی دوکان پر آویزاں دیکھا اور گبریلا مسترال کی تصویر پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ پر موجود تھی جسے اسی دن میں نے بغور دیکھا تھا اور اس کے متعلق ابتدائی معلومات کا مجھ پر انکشاف ہوا تھا۔چلی،پیرو کے بعد جاپان میں چونکہ میرا قیام زیادہ رہا جہاں کے کرنسی نوٹوں پر یہ مشترک اور قابل تقلید بات نوٹ کی،جاپان کے دس ہزار ین کے کرنسی نوٹ پر بھی ایک شاعر کی تصویر ہے جو کہ جاپان کا سب سے بڑا کرنسی نوٹ ہے۔ان کے علاوہ بھی بے شمار ملکوں میں پڑھنے لکھنے سے متعلق لوگوں کی تصاویر کرنسی نوٹوں پر موجود ہیں۔

تجویز تو یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ قائداعظم کے علاوہ اقبالؔ،فیضؔ یا کسی اور شاعر،ادیب کی تصویر بھی کرنسی نوٹ پر ہونی چاہئے لیکن ہمارے ہاں مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم کسی بھی شخصیت پر متفق ہی نہیں ہو پاتے ہیں اور بڑے سے بڑا آدمی بھی ہمارے ملک میں عام طور پر متنازعہ ہی رہتا ہے۔اگر احمد فرازؔ کی تصویر بیس روپے کے کرنسی نوٹ پر موجود ہوگی تو اس سے فن کو اعتبار ملے گا لیکن

فرآز صاحب جیسے سراپاء محبت شخص کے بھی بے شمار ناقدین موجود ہیں۔گرچہ میں اس فلسفے کو نہیں مانتا کہ پاکستان میں قحط الرجال ہے اس صورت حال کو زیاد سے زیادہ نا اتفاقی اور عدم برداشت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ہماری کئی رسمیں بہت ہی خوبصورت ہیں جن میں سے ایک اچھی رسم یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص دیار غیر سے واپس لوٹتا ہے تو دوست احباب اور رشتہ داروں کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر آتا ہے۔لاطینی امریکہ چونکہ دور افتادہ ہے اور دنیا کے اس حصے کی بہت کم چیزیں ہم تک پہنچ پاتی ہیں اس لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہاں سے وطن واپسی پر کوئی نہ کوئی سوغات دوستوں کے لئے ضرور لے کر جاؤں۔شعر و سخن سے تعلق کی بنیاد پر حرفوں سے زیادہ معتبر کوئی چیز میری نظر میں تھی ہی نہیں۔اس لئے میں اپنے لوگوں کے لئے اس سفر کی یادگار، یہ نظمیں لے کر آیا ہوں۔ان نظموں کے ساتھ تعارف اور حواشی تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو اس ماحول اور پس منظر کا بھی اندازہ ہو سکے جس میں یہ نظمیں تخلیق کی گئی ہیں تا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوا جا سکے۔

اس موقع پر صاحبِ طرز شاعر اور صحافی منّو بھائی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ وہ اس کتاب کی اشاعت کے بنیادی محرکات میں شامل ہیں۔وہ کیسے؟اس بات کی شائد انہیں بھی خبر نہ ہو مگر یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔منّو بھائی نے کچھ سال پہلے مجھ سے گبریلا مسترال کی شاعری کا انگریزی ترجمہ لانے کی فرمائش کی تھی۔اس کی وجہ ان کی مجھ سے محبت و اپنائیت کے علاوہ یہ بھی تھی میں ان دنوں چلّی میں مقیم تھا، پہلے تو میں نے چلّی میں اس کا انگریزی ترجمہ تلاش کیا جو کہ مجھے نہ مل سکا، وجہ قابل فہم تھی چونکہ وہاں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے اور انگریزی پڑھنے والے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔اسی دوران میرا کئی بار امریکہ جانا ہوا اور بعد از تلاش بسیار میں وہاں بھی مسترال کی شاعری کا انگریزی ترجمہ ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔اس پر نیویارک سے میں نے منّو بھائی کو پوسٹ کارڈ بھیجا کہ میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا۔

میرے بڑے بھائی رانا بابر حسین جو آج کل ممبر پارلیمنٹ ہیں ان دنوں لندن میں مقیم تھے،

میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا اور مسترال کی شاعری کا انگریزی زبان میں ترجمہ لانے کو کہا۔ جب وہ پاکستان آئے تو اپنے ساتھ دو کتابیں تو لے کر آئے مگر پابلو نرودا کی نظموں پر مشتمل اور بتایا کہ انگلینڈ میں بھی مسترال کا ترجمہ دستیاب نہیں ہے۔ میں نے منّو بھائی سے تو معذرت کر لی مگر سوچا کہ وہ تو ہسپانوی زبان نہیں پڑھ سکتے اس لئے گبریلا مسترال کی شاعری سے لطف اندوز ہونے سے قاصر ہیں مگر میں تو پڑھ سکتا ہوں، پتا تو چلے آخر اس نے ایسا کیا خاص لکھا ہے؟ لہٰذا میں نے مسترال کو پڑھنا شروع کیا اور پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ ان نظموں نے مجھے بے حد لطف دیا جس پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ شاعری کا ذوق رکھنے والے باقی دوستوں کو بھی اس خوشگوار اور منفرد تجربے سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔

نرودا کے اٹلی میں قیام پر بننے والی فلم "IL POSTINO" دیکھنے کے بعد میں اسکی شخصیت کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں اس کی شاعری پڑھنا شروع کی۔ "Residence on Earth" سے شروع ہونے والا یہ خوشگوار مطالعہ آج تک جاری ہے، جس کی کچھ نظموں کا ترجمہ اردو زبان کے قارئین کی نذر کر کے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

لاطینی امریکہ میں قیام کے دوران وہاں کے لوگوں نے جس گرم جوشی، محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا یہ کتاب اس خلوص اور چاہت کے اعتراف کی ایک حقیر سی کوشش بھی ہے.

ٹیکساس نامہ

ٹیکساس امریکہ کی دیگر ریاستوں سے کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ یہ غالباً واحد ریاست ہے جو کسی وقت میں ایک الگ آزاد ملک کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتی تھی۔ اس سے قبل یہ میکسیکو کا حصہ بھی رہی اور اگر اس سے بھی پیچھے چلے جائیں تو یہ سپین کی نوآبادی تھی، کئی صدیوں تک ہسپانیہ کے زیر تسلط رہی۔ یورپی مہم جو کولمبس کی دریافت سے پیشتر بھی لوگ یہاں آباد تھے مگر ان کے تذکرے کا یہ مناسب موقع نہیں ہے اس سے بات اور طرف چلی جائے گی۔

میرے ذہن میں ٹیکساس کا تصور بالکل مختلف تھا۔ لق ودق صحرا اور اس میں گھوڑوں پر بیٹھے کاؤبوائے جن کے سر پر ہیٹ اور دائیں بائیں پستول ٹنگی ہوئی ہے۔ پہلی خوشگوار حیرت یہ ہوئی کہ یہ ایک سرسبز وشاداب میدانی علاقہ ہے جس میں بے شمار جھیلیں ہیں۔ بحیثیت مجموعی ٹیکساس کی سرزمین پنجاب اور سندھ کے جغرافیے سے زیادہ میل کھاتی ہے، رقبہ البتہ ان دونوں صوبوں کے مجموعی رقبے سے دوگنا ہے۔ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے یہ امریکہ کی دوسری سب سے بڑی ریاست ہے۔ پچاس ریاستوں میں بسنے والے پینتیس کروڑ عوام میں سے تین کروڑ سے زائد امریکی اسی ایک ریاست میں رہتے ہیں۔ تین کروڑ کی آبادی تو مگر سرکاری اعداد وشمار بیان کرتے ہیں، اصل صورتحال یہ ہے کہ غیر قانونی تارکین وطن اس ریاست کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں، جو کہ زیادہ تر لاطینی امریکہ سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ میکسیکو کا بارڈر چونکہ اس کے ساتھ خاصا طویل ہے اس لئے سفری کاغذات کے بغیر امریکہ میں داخلے کا یہ آسان راستہ ہے۔ میں کئی برس چونکہ لاطینی امریکہ میں قیام پذیر رہا ہوں اس لئے ٹیکساس کے ساتھ اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہاں 30 فیصد آبادی گھروں میں ہسپانوی بولتی

ہے، جوکہ میں بھی بول لیتا ہوں اور پچپن فیصد رنگین لوگ (کلرڈ کا لفظی ترجمہ) ہیں کوچۂ بازار میں سپینش بولنے والوں کی تعداد پچاس فیصد ہوگی۔گرچہ گھروں میں 65فیصد انگریزی ہی بولی جاتی ہے۔میری اپنائیت محسوس کرنے کی ایک وجہ ٹیکساس کا پرچم بھی ہے، جوکہ معمولی فرق کے ساتھ چلی کے جھنڈے جیسا ہے، جہاں میرے کئی برس بیتے ہیں۔

امریکہ میں سڑکیں کنکریٹ کی ہیں۔ہماری طرح اسفالٹ کی سڑکیں کہیں کہیں نظر آتی ہیں مگر تمام اہم شاہراہیں کنکریٹ سے ہی بنی ہیں۔ان کو تعمیر کرنے میں کوئی نہ کوئی حکمت موجود ہوگی مگر ایک مسئلہ ہے کہ اسفالٹ کی سڑک کے مقابلے میں گاڑی گزرنے پر یہ شور زیادہ مچاتی ہے۔چاہے آپ ٹیسلا کی الیکٹرک گاڑی میں ہی سفر کیوں نہ کر رہے ہوں، ان سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے اسفالٹ جیسی بے آواز کیفیت میسر نہیں آتی۔حالانکہ الیکٹرک گاڑیوں کا شور نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔چونکہ شور تو انجن کے چلنے سے زیادہ تر پیدا ہوتا ہے، جو ان میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا۔یہ الگ بات ہے کہ بقول شخصے الیکٹرک گاڑی میں بیٹھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی کار کی بجائے فریج میں سفر کر رہے ہیں، چونکہ ریفریجریٹر اور الیکٹرک گاڑی کی آواز ملتی جلتی ہی ہوتی ہے۔چھوٹی ذیلی سڑکیں اسفالٹ کی بھی نظر آجاتی ہیں اور کہیں کہیں کنکریٹ کے اوپر اسفالٹ کی تہہ جمائی ہوئی سڑک بھی نظر سے گزرتی ہے۔

ٹیکساس کا سب سے بڑا شہر ہیوسٹن ہے جس کی آبادی پچیس لاکھ ہے۔میں اگرچہ ڈیلاس کی پرواز سے پہنچا جوکہ دوسرا بڑا شہر اور امریکن ایئر لائن کا مرکز ہے مگر سب سے بڑے شہر کو دیکھنے کی تمنا تھی، جس کی ایک وجہ یہاں خلائی ادارے ناسا کا مرکز ہے۔ناسا کے خلائی ادارے کے دورے کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میری امریکیوں کے کے بارے میں رائے نظرثانی کی متقاضی محسوس ہوئی۔ہوا یہ کہ ہیوسٹن میں جن مقامات کی سیاحت کا منصوبہ بنایا ان میں ناسا کے زیر انتظام خلائی تحقیق کا مرکز بھی شامل تھا۔مختلف طرح کی خلائی شٹل اور کل پرزے دیکھنے کے بعد ہم اسی مرکز کے تھیٹر میں چلے گئے جسے سینما ہال کہیں تو آپ کا تصور زیادہ واضح ہو جائے گا۔خلا سے متعلق ڈاکومنٹری فلم دیکھتے ہوئے میرے دوست و میزبان آفتاب بھٹی نے اپنی قیمتی گھڑی اتار کر سیٹ کے ساتھ رکھ دی۔شاید گرمیوں میں پسینے سے الجھن سبب

رہا ہوگا۔ڈاکومنٹری فلم دیکھ کر ہم تھیٹر سے باہر آ گئے۔کسی دوسری خلائی مشین کی تاریخ دیکھنے لگے کہ اپالو5 منصوبہ بھلے کامیاب نہیں ہو سکا مگر اس کا خلائی جہاز دو ارب ڈالر کا بنا تھا جو بغیر سفر کئے ویسے کا ویسا ہی عجائب گھر میں ماڈل کے طور پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔اسی دوران آفتاب بھٹی کو یاد آیا کہ وہ گھڑی تو تھیٹر میں ہی بھول آیا ہے۔ہم الٹے پاؤں تھیٹر کی طرف لوٹے اور سیکیورٹی اہلکار کو بتایا کہ سینما میں ڈاکومنٹری دیکھتے ہوئے ہم گھڑی بھول گئے ہیں، کیا آپ کو ملی ہے؟اس نے پوچھا گھڑی کا رنگ کون سا تھا؟ جواب سیاہ بتایا تو اس نے کہا کہ ہاں!ایک گھڑی ملی ہے،آپ لوگ اس گیسٹ کاؤنٹر پر چلے جائیں۔وہاں پہنچے تو خاتون نے چھوٹتے ہی سوال کیا کہ کیا گھڑی سیاہ رنگ کی تھی۔ہم نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے فوراً دراز سے ایک لفافہ نکالا اور گھڑی میرے سکول کے ہم جماعت دوست کو تھما دی۔اس پر میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس لڑکی کو کہا کہ جاپانیوں کی ایمانداری کا تو میں قائل ہوں مگر امریکیوں کے بارے میں میرے رائے آج تم لوگوں نے تبدیل کر دی ہے۔مجھے نہیں لگتا تھا کہ ایسی لاوارث چیز کوئی اس طرح بآسانی لوٹا سکتا ہے۔اسی لئے پنجابی زبان کا یہ پر از حکمت قول کبھی پرانا نہیں ہوتا کہ

یا واہ پیا جانے، یا راہ پیا جانے

واقعی جب تک آپ کا کسی سے واسطہ نہیں پڑتا اور کسی راستے پر آپ چلے نہیں ہوتے تو آپ کو اس کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں ہوتا، واسطہ پڑنے پر ہی کھرے کھوٹے کا فرق پتہ چلتا ہے۔

ہیوسٹن سے ایک گھنٹے کی مسافت پر گالویسٹن کا ساحل اور اس کے ساتھ آباد خوبصورت شہر ہے۔اسے قصبہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیونکہ بڑے شہروں والی ہنگامہ خیزی یہاں نہیں نظر آتی۔ساحل سمندر کے ساتھ پیدل چلنے کے لئے ایک طویل فٹ پاتھ ہے، بنیادی طور پر تو یہ پگڈنڈی ساحل کی دیوار ہے۔دو میٹر اونچائی کی حامل اس دیوار کے ساتھ ہی مرکزی شاہراہ ہے،شائد 1911 میں جب یہ تعمیر کی گئی تو کوئی خاصے کی چیز ہوگی اور بڑا کارنامہ شمار کیا جاتا ہوگا،تبھی تو سنگ بنیاد، رسم افتتاح اور یادگاری تختیاں کثیر تعداد میں ایستادہ ہیں۔وقت وقت کی بات ہے، آج اگر کسی ساحل سمندر پر ایسی کوئی دیوار تعمیر ہو تو اس پر سنگ مرمر کی تختیاں تو کجا، یہ سرے سے گفتگو کا موضوع بھی شائد نہیں بن سکتی۔انتظامیہ

کے اعلیٰ عہدیداروں اور سیاسی اکابرین کے نام گرامی جو پتھروں پر کنداں ہیں تاریخ کا حصہ بننے سے محروم ہی رہیں گے۔

ہسپانوی طرزِ تعمیر کے شاہکار ہوٹل کی تعمیر بھی اسی سال مکمل ہوئی جس میں ہمارا قیام تھا اور یہ ساحلی دیوار کے بالکل قریب گرینڈ گیلوس کہلاتا ہے، جو ہسپانوی نوآبادیاتی عہد کی یاددلاتا ہے۔ صبح سویرے میرے دوست آفتاب بھٹی نے ساحل کی سیر کے لئے مجھے جگایا، یہ ہوٹل اس نے غالباً ساحل کے منظر اور نزدیکی کی وجہ سے ہی منتخب کر کے بکنگ کروائی ہوگی، مگر میں نے کہا کہ کچھ دیر اور سونا ہی بہتر ہے اس لئے وہ اکیلا ہی ساحل کی سیر کے لئے چلا گیا۔

جزائر ہوائی

ہوائی چپل خریدتے ہوئے کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا کہ اس کا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جزائر ہوائی سے بھی کوئی تعلق واسطہ ہوسکتا ہے۔ ہونولولو جزیرے پر پہنچا تو ساحل پر موجود سیاحوں کے پاؤں میں پڑی چپل پر غور کرتے ہی یہ دیرینہ عقدہ کھلا کہ ہماری چپل کو ہوائی سے کیا نسبت ہے۔ امریکہ کے جغرافیہ میں سب سے آخر میں شامل ہونے والی اس ریاست کو 137 جزائر کا جھرمٹ کہتے ہیں۔ ہوائی کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ امریکہ کی یہ واحد ریاست ہے جس کی سرکاری زبان انگریزی نہیں بلکہ ہوائین زبان ہے اور دوسرا امتیاز یہ کہ براعظم ایشیا میں شامل اکلوتی امریکی ریاست ہے۔ مقامی زبان کیسے سفر کرتی ہوئی یہاں پہنچی؟ یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے، پندرہ صدیاں پہلے ان جزائر کو پولینیشن لوگوں نے آباد کیا۔ بحرالکاہل کے چھوٹے چھوٹے جزائر پر آباد آسٹریلیا، نیوزی لینڈ سے لے کر چلی تک پھیلے ہوئے ان لوگوں کی کل آبادی آج کل تیس لاکھ بتائی جاتی ہے مگر اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ بات ہوائی کی ہو رہی ہے تو بتاتا چلوں ہوائی چیزوں سے میرے شہر کے لوگ بہت گھبراتے ہیں۔ گھر میں ان کا نام لینا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بڑے سیانے بچوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنا اپنے گھر ان چیزوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ہوسکتا ہے ہوائی چپل کی طرح ہوائی چیزوں کا بھی ان جزائر سے کوئی تعلق واسطہ ہو مگر میری ناقص معلومات میں ایسا کچھ نہیں آسکا۔ البتہ ویکیکی کا نام سن کر کسی خوبصورت ساحل سمندر سے زیادہ جنات، پریوں کی کہانی کے کسی دیوتا کا سا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

ہونولولو اس جھرمٹ کا سب سے بڑا جزیرہ ہے، جس کی آبادی ہمارے میاں چنوں جتنی، یعنی ساڑھے تین لاکھ کے قریب ہے۔ جزائر ہوائی کی کل آبادی پندرہ لاکھ سے کچھ کم

ہے، جوکہ سو جزائر پر پھیلی ہوئی ہے۔کئی جزیرے بے آباد ہیں،یعنی ایک بھی انسان ان پر زندگی بسر نہیں کرتا۔حالانکہ قدرتی حسن سے مالا مال ان تمام جزائر میں پھل سبزیاں وافر ہیں اور جوتے کپڑے یہاں پر ویسے ہی اضافی محسوس ہوتے ہیں کہ تمام برس درجہ حرارت وہی رہتا ہے جو جہاز کے اندر یعنی 24 سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔آج ایک خاتون پولیس آفیسر جو گشت پر تھی اور ساحل پر ہونے والی نقل وحرکت پر غور کر رہی تھی میرے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔روایتی مغربی انداز میں گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے میں نے موسم کا تذکرہ کیا کہ کیا خوبصور ت موسم ہے یہاں کا،ایسا حسین موسم تو دنیا میں شاید کہیں بھی نہیں ہوگا۔میرے تجزیے سے اتفاق کرتے ہوئے کہنے لگی سال بھر 60 سے 70 فارن ہائیٹ کے درمیان ہی یہاں کا درجہ حرارت رہتا ہے جو کہ نہایت شاندار ہے۔حالانکہ مجھے فارن ہائیٹ سکیل کی کبھی بھی سمجھ نہیں آئی مگر امریکی لوگ درجہ حرارت کی بات اسی سکیل سے کرتے ہیں لہٰذا میں نے بات کا پہلو تبدیل کر دیا، پوچھنے لگا کہ میں نے سن رکھا ہے کہ جزائر ہوائی میں شادی شدہ عورتیں کان کے اوپر بالوں میں پھول ایک طرف رکھتی ہیں، جبکہ غیر شادی شدہ دوسری طرف،اب یہ دائیں کون رکھتی ہیں اور بائیں جانب کون سی؟ مجھے کنواریوں اور سہاگنوں کے اس طرز عمل کی وضاحت درکار ہے۔اس پر پولیس افسر نے میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ سمجھایا کہ میں تمہیں یہ بات یاد رکھنے کا ایسا ٹوٹکہ بتاتی ہوں کہ تم کبھی نہیں بھولو گے۔شادی کی انگوٹھی جس طرح بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنی جاتی ہے،اسی طرح محبت میں مبتلا اور منسوب خواتین بھی بالوں کے بائیں جانب کان کے اوپر سفید رنگ کا ہوائی کا مخصوص گلچین سے ملتا جلتا پھول لگاتی ہیں جبکہ غیر منسوب اور محبت کی منتظر، دستیاب خواتین اپنے دائیں کان کے اوپر بالوں میں یا پھر جوڑے کے دائیں طرف یہی مخصوص ہوائی کی شناختی علامت سمجھا جانے والی سفید پھول ٹانکتی ہیں۔فربہ خوش مزاج پولیس والی نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ تم دل کو یاد رکھو، دل چونکہ انسان کے سینے کے بائیں جانب ہوتا ہے اسی لئے شادی کی انگوٹھی بھی بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں پہنی جاتی ہے، بلکہ ایسے ہی پھول بھی دل کی سمت میں ہی ٹانکا جاتا ہے۔یہاں البتہ ایک جملہ معترضہ ہے کہ پھول کے دائیں اور بائیں ٹانکنے کا تعلق شادی سے نہیں بالکل محبت میں باندھے گئے عہدہ و پیمان سے ہوتا ہے،اگر دونوں کے درمیان وفا نبھانے کا اقرار موجود ہے تو پھر پھول دل کی طرف چلا جائے گا، چاہے شادی نہ بھی ہوئی ہو۔کہنے لگی

کہ دیکھونا، پہلے لوگ زیادہ مہذب ہوتے تھے۔اب بچوں کی موجودگی میں کوئی باحیا عورت یہ تھوڑی کہہ سکتی ہے کہ وہ محبت کے لئے دستیاب ہے؟ مگر پھول ٹانکنے سے محبت کے متلاشی سمجھ جاتے ہیں کہ بات ہوسکتی ہے۔ گفتگو کے دوران خاتون نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں سنہری چھلا دکھاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ ڈیوٹی کے دوران بالوں میں پھول ٹانکنے سے ڈسپلن کی وجہ سے گریز کرتی ہے۔

ہوائی کا دنیا بھر میں سیاحتی مرکز کے طور پر شناخت بنانے کا عمل اور امریکہ میں اس کی شمولیت ایک ساتھ ہی شروع ہوئی کہیں تو یہ زیادہ غلط نہیں ہوگا۔وہ یوں دیکھ لیں کہ جزائر کے جھرمٹ ہوائی کا سب سے بڑا اور معروف جزیرہ ہونولولو ہے، اس میں پہلا باقاعدہ ہوٹل 1901 میں بنا اور امریکہ کے ساتھ اس کا الحاق سن 1900 میں ہوا تھا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ آج بھی یہ ہوٹل قائم ودائم اور اسی طرح مقبول ہے۔یہ سطور میں اسی سات منزلہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔سامنے سمندر ہے اور ساحل پر لوگوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔شام کے وقت سورج ڈوبنے کا منظر یہاں بہت ہی دل آویز ہوتا ہے۔آپ اس بات سے اندازہ لگالیں کہ اگر وائے کیکی ساحل پر آج غروب آفتاب کے وقت تین ہزار لوگ تھے تو ان میں سے ڈھائی ہزار افراد اپنے موبائل فون سے ڈوبتے سورج کی تصویر کھینچ رہے تھے یا ویڈیو بنانے میں مشغول تھے،تاکہ اس دل کش منظر کو محفوظ بنالیں۔میں باقی ماندہ پانچ سو لوگوں میں سے تھا،چونکہ یہ حرکت مجھے تو بدذوقی محسوس ہوتی ہے۔آپ کو آنکھوں اور دل میں ایسے منظر محفوظ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ،ایسی تصویریں انٹرنیٹ میں کبھی بھی مل جائیں گی جو یہ افراد کھینچ رہے تھے،خیر اپنا اپنا سوچنے کا انداز ہے ہر کسی کا اور اس بابت سب آزاد ہیں۔

پرل ہاربر اور اسی مقام پر واقع میوزیم بھی اہم سیاحتی مقام ہے۔اس میوزیم کو اسی مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں پر جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے دوران ہوائی حملہ کیا تھا، 1941 میں جاپان کے اس ''کامی کھازی'' حملے جس کا لفظی ترجمہ تو ''خدا کی ہوا'' ہے لیکن اسے خودکش حملہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔جاپانی جہاز جب اڑتے تو ان میں صرف اتنا تیل ہوتا جس سے وہ اپنے ٹارگٹ تک پہنچ جائیں،واپسی کا پٹرول نہیں ڈالا جاتا تھا اور جنگی جہاز کو بارودی مواد سے بھر دیا جاتا تھا،یہ جہاں جہاں بھی ٹکراتا،تباہی مچادیتا تھا۔ہمارے ہاں جو کہتے ہیں کہ''ہوا بدل گئی ہے'' یا آجکل ادھر کی

ہوا ہے،اس کی ہوا بن گئی ہے، بالکل یہی مفہوم اور مطلب ’’ کامی کازی‘‘ پائلٹوں کا ہوتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ہوا بتا رہے ہیں۔حق کی فضا بنانے والے ہیں۔ پرل ہاربر میوزیم کا اہم حصہ وہ بحری بیڑہ ہے جس پر جاپان نے اپنی شکست کی دستاویز پر دستخط کر کے ہتھیار ڈالے تھے۔

ہوائی باتیں

جزائر ہوائی کے متعلق گفتگو کو ہوائی باتیں قرار دینا مجھے تو کسی طور پر بھی غیر مناسب نہیں لگتا۔عنوان کی وضاحت کر کے آگے بڑھنے سے پہلے امریکی دانشور و مصنف مارک ٹوئن کی اس جنت نظیر خطہٗ ارضی کے بارے میں ایک خوبصورت تشبیہ کا ذکر کرنا چاہوں گا، کہ ہوائی کے جزائر کی مثال سمندر میں تیرتے ہوئے بحری جہازوں کے ایک جھتے کی سی ہے، جن کا لنگر ساگر کے اندر ڈالا ہوا ہے۔امریکہ کے مرکزی جغرافیہ سے بتیس سو کلومیٹر دور بحر الکاہل میں واقع جزائر ہوائی کی اپنی منفرد ثقافت اور زبان ہے۔الاسکا اور ہوائی امریکہ کی دو ایسی ریاستیں ہیں جن کا زمینی رابطہ باقی 48 ریاستوں کے ساتھ نہیں ہے۔صدر ڈونلڈ ٹرمپ جس طرح کینیڈا کو امریکی بنانے کے درپے ہے، اس سے یہ امکان پیدا ہو گیا ہے کہ روس سے خریدی گئی ریاست الاسکا بھی اب باقی امریکہ کے ساتھ زمینی رابطے میں آجائے گی، یوں ہوائی ہی وہ واحد ریاست ہو گی جو جغرافیائی اعتبار سے براعظم شمالی امریکہ کا حصہ نہیں ہو گی۔

ہوائی کا ریاستی پرچم دیکھ کر جھٹکا سا لگا۔اس کی وجہ جھنڈے کے ایک کونے پر یونین جیک یعنی برطانوی پرچم کا ہونا تھا۔آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کی تو سمجھ آتی ہے کہ وہ برطانوی بادشاہ کو اب بھی اپنا سربراہ مملکت مانتے ہیں، مگر ہوائی کا کیا تعلق بنتا ہے؟ ذرا سی کھوج لگائی تو پتہ چلا کہ اٹھارھویں صدی کے اختتام پر برطانوی جہاز ران ادھر آئے تو برطانوی پرچم ہوائی کے لوگوں کو تحفتاً پیش کیا گیا۔ایسے کھلے دل کے لوگ ہیں یہاں کے باسی کہ یونین جیک کو ہی بطور قومی پرچم اپنا لیا۔بعد ازاں آٹھ بڑے جزائر کی نسبت سے یونین جیک کے ساتھ آٹھ پٹیاں شامل کر دی گئیں۔یوں تو تاج برطانیہ کا بھی مختصر عرصے کے لئے ان جزائر پر قبضہ رہا مگر امریکہ کے ساتھ الحاق سے پیشتر یہاں بادشاہت قائم

تھی۔مقامی قبائلی سردار بادشاہ کہلاتے تھے۔

غروب آفتاب سے کچھ پہلے ساحل پر سیاحوں کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے۔چہل قدمی کرتے کرتے ایک بڑی کشتی کے پاس پہنچا۔جو سمندر کی سیر کے لئے تیار کھڑی تھی،ساحل پر کھونٹے سے باندھے گئے رسے لپیٹے جا چکے تھے اور ناخدا گہرے پانیوں میں اس بیڑے کو لے جانے کے لئے بالکل تیار تھا،اسی ہنگام میں قریب پہنچا تو اس فیری کا کنڈکٹر سمجھا کہ میں بھی مسافر ہوں اور شاید تاخیر سے پہنچا ہوں، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا،جلدی سے سوار ہو جاؤ،ایسا نہ ہو کہ ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنے سے ہم سب ہی محروم رہ جائیں!!میں نے عرض کیا کہ بھائی میرے پاس تو ٹکٹ ہی نہیں ہے۔اس پر معاون ملاح نے کہا کہ کوئی بات نہیں،ٹکٹ آپ کو اس سفینے کے اندر بھی مل جائے گی اور اس کے ساتھ آپ کی پسند کا ایک مشروب مفت مہیا کیا جائے گا۔سوچنے کے لئے زیادہ وقت نہیں تھا،اس لئے میں ''انھے واہ'' ہی کشتی میں جا بیٹھا بغیر کسی منصوبہ بندی کے۔سچی بات تو یہ ہے کہ ہونولولو جزیرے پر اپنے قیام کے دوران یہ میرا سب سے خوبصورت تجربہ رہا۔درجہ حرارت ایسا کہ خنکی اور گرمی ،سردی کے درمیان تمیز کرنا مشکل تھا مگر دلکش ایسا کہ الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اپنی زندگی میں زندہ وہیل مچھلی بھی دیکھوں گا،سفر کے ابتدائی نصف گھنٹے میں ہی سمندر کے اس مقام پر پہنچے ،جو وہیل مچھلیوں کی آماجگاہ ہے۔ہمارے بیڑے سے کئی گنا بڑی وہیل مچھلی کی دم تھی،اس پر یہ دلچسپ تبصرہ کپتان نے لاؤڈ اسپیکر پر فرمایا کہ یہ جو نظارہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں اس میں نظر آنے والی وہیل مچھلی ابھی اپنے بچپن میں ہے۔چشم تصور میں دیکھ لیا کہ اگر بچپن میں یہ عالم ہے تو بلوغت میں اس مچھلی کا سائز کیا ہوگا۔گہرے نیلے رنگ کے پانیوں والے اس سمندر میں ایسا جادو ہے کہ آپ تکتے تکتے کبھی بھی اکتاتے نہیں ہیں۔خوبصورتی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو بحرالکاہل کے پانیوں نے ان جزائر میں پیدا کر رکھا ہے۔غروب آفتاب کا منظر دیکھا تو مبہوت رہ گیا،صاف کھلے آسمان پر تیرتی ہوئی بادلوں کی ٹکڑیوں سے دور پرے زرد روشنی کا ایسا دل آویز نظارہ کہ دنیا کے تمام مسائل چھوٹے لگیں گے۔

امریکی عوام کے متعلق اگر آپ نے بدتمیزی اور بدلحاظی کا چرچا سن رکھا ہے، یا پھر خود منہ پھٹ لوگوں کے کورے چٹے رویے کو بھگت چکے ہیں، جس سے خون سفید ہوگیا کا محاورہ یاد آ گیا ہو تو جزائر ہوائی میں آ کر آپ کے تمام گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔ انتہائی محبت و مروت سے پیش آنے والے لوگ ہیں۔ مسکراتے ہوئے ملتے ہیں اور ہنستے کھیلتے ہوئے ملنساری کا پیکر نظر آتے ہیں۔ شائد یہ مٹی کا اثر ہے۔ ہمارے پنجاب کا اساطیری انقلابی کردار دلا بھٹی جو تمام عمر مغلیہ سلطنت سے برسرپیکار رہا، جس کی یاد میں لوہڑی کا تہوار منایا جاتا ہے، ایک بار اکبراعظم اس کی قید میں آ گیا اور پھر وقت بدلا تو دلا بھٹی مغل شہنشاہ اکبر کا قیدی بن گیا، دربار میں پیش کیا گیا، تو رویہ صلح جویانہ تھا، کہتے ہیں کہ اکبر نے اس کے علاقے سے لائی ہوئی مٹی کی دربار میں ایک جگہ ڈھیری لگوادی اور جب دلے بھٹی کو اس پر کھڑا کیا گیا تو وہ پھر بغاوت کی باتیں کرنے لگا۔ دلا بھٹی سے منسوب ہے کہ اس کی جائے پیدائش، پنڈی بھٹیاں والی بار کی مٹی میں یہ تاثیر ہے کہ وہ انسان میں بغاوت پیدا کرتی ہے۔ جس طرح لوگ زمینوں کا حوالہ ہوتے ہیں اور انہیں بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سے زمین ومکان بھی لوگوں کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ مٹی کی تاثیر لوگوں کے رویے میں نظرانداز کرنا کسی بھی جہاں دیدہ شخص کے لئے ممکن نہیں ہے۔ ہوائی کی مٹی میں انسان کو خوش اخلاق بنادینے اور ملنساری کی خوبی اجاگر کردینے کی جادوئی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ 135 جزیروں پر بکھرے ہوئے ان پندرہ لاکھ لوگوں کے نقش و نین ایشیائی ہیں، رنگت گندمی، ہمارے جیسی اور آنکھیں چینیوں، جاپانیوں جیسی نیم باز ہیں۔ قدیم مذہب یہاں کا ہمارے ہندومت سے ملتا جلتا محسوس ہوتا ہے، عیسائیت، بدھ ازم اور اسلام کے پیروکار بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ آبادی کا تنوع دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے قوس قزح نے رنگ بکھیر دیئے ہیں، جہاں ہر رنگ کی انفرادیت دوسرے رنگوں کے حسن کو اجاگر کرنے کا سبب بن رہی ہے۔

تاریخ ساز امریکی انتخابات

سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اگر ڈونلڈ ٹرمپ صدر منتخب ہو گیا تو وہ اپنی صدارتی مدت کے دوران سپریم کورٹ کے تین نئے جج تعینات کردے گا۔ یہ بھی ٹرمپ کی طرح یقیناً اسقاط حمل کے خلاف ہوں گے۔ یوں 2035 تک سپریم کورٹ میں ری پبلکن سوچ کے حامل ججوں کی اکثریت ہو جائے گی، جو کہ بہت ہی خطرناک بات ہے۔ یہ الفاظ میرے امریکی دوست کیون کے ہیں۔ اس تبصرے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عام امریکی ووٹر کا سوچنے کا انداز ہم سے مختلف ہے اور جن مسائل ومعاملات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اپنے امیدوار کا انتخاب کرتے ہیں وہ بھی ہم سے قطعی طور پر مختلف ہیں۔ یوں تو مشتاق یوسفی کا یہ بیان سچ پر مبنی ہے کہ گورے لوگ سیاست اور جنسی معاملات پر گفتگو صرف نشے کی حالت میں ہی کرتے ہیں، انتخابی ماحول کو مگر استثنیٰ حاصل ہے، آج کل کے دن ایسے ہیں کہ وہ لوگ بغیر نشے کے بھی کھل کر اپنی سیاسی آراء کا اظہار کرنے سے ہچکچاتے نہیں ہیں۔

کل ہی میرا دوست جو یوٹاہ سے تعلق رکھتا اور کافی مذہبی آدمی ہے، بتا رہا تھا کہ گزشتہ ہفتے جب وہ امریکہ میں تھا تو اس کے چچا اور والد کے درمیان صدارتی انتخاب کے موضوع پر شدید بحث ہوئی اور بات تلخ کلامی تک جا پہنچی۔ چچا محترم ڈونلڈ ٹرمپ کے سخت حامی اور والد صاحب اتنے ہی شدید مخالف ہیں۔ میرا دوست ٹام چپ چاپ بڑوں کی بحث سنتا رہا، یہاں تک کہ اس کا چچا والد صاحب سے ناراض ہو کر چلا گیا۔ جاتے جاتے یہ کہہ گیا کہ ٹرمپ امریکہ کے لئے آخری امید ہے ۔اس کے جانے کے بعد والد صاحب بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگے کہ مجھے کوئی ٹرمپ کی شکل ناپسند نہیں ہے مگر یہ لوگ جیسے اس جوکر کو مسیحا بنا کر پیش کرتے ہیں مجھے اس بات سے تکلیف ہوتی ہے۔

امریکہ کے اقتدار کا ہما ڈونلڈ ٹرمپ کے سر پر سایہ فگن ہوگا یا پھر قسمت کی دیوی کاملا ہیرس پر مہربان ہوگی، اس کا فیصلہ تو پانچ نومبر بروز منگل کی شام ہوگا، یہاں تو ہم ان عوامل کا جائزہ لے سکتے ہیں جو ان امیدواروں کی فتح یا شکست کا سبب بن سکتے ہیں۔کیسی حیران کن بات ہے کہ دو صدیاں ہونے کو آئی ہیں اور امریکہ کا صدارتی انتخاب ہر چار سال بعد نومبر کے پہلے منگل کے دن ہو جاتا ہے۔روایت کا تسلسل اگر جمہوری ہو تو بڑی قابل ستائش بات ہے۔ یہ انتخاب کئی حوالوں سے روایت شکن اور روایت ساز ہے۔اگر کملا ہیرس صدر منتخب ہو جاتی ہیں تو آزادی کے بعد وہ امریکی تاریخ کی پہلی خاتون ہوں گی جن کو یہ منصب نصیب ہوگا۔

امریکہ میں عمومی روایت یہی ہے کہ جو بھی صدر منتخب ہو جائے اسے دوسرے عرصۂ صدارت کے لئے بھی منتخب کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔بعض اوقات دوسرے عرصے کے لئے صدور ناکام بھی ہو جاتے ہیں، جیسے جارج بش سینئر کی مثال ہے، یوں بھی ہوتا ہے کہ دوسرے عرصے کے لئے انتخاب نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، جیسا کہ موجودہ صدر جو بائیڈن نے کیا، مگر ایسا کبھی بھی نہیں ہوا کہ کوئی صدر اپنا صدارتی الیکشن ہار جانے کے چار سال بعد امیدوار بنا ہو اور پھر دوبارہ صدر بھی منتخب ہو گیا ہو۔اس لئے جو بھی امیدوار منتخب ہوگا وہ کئی حوالوں سے منفرد اعزاز کا حامل ہوگا، اسی بنیاد پر ہم موجودہ امریکی صدارتی انتخاب کو تاریخ ساز کہہ سکتے ہیں۔

ٹرمپ کی حمایت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ انتھک محنتی اور بڑبولا ہے، مذہبی طبقات کی عمومی حمایت اسے حاصل ہے۔ایک پاکستانی، ٹرمپ کے حامی جو خود بھی کانگریس کا انتخاب لڑ رہے ہیں ان سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جواب بڑا مدلل تھا، پاکستانی نژاد امیدوار کا کہنا تھا کہ میں اب مسجد میں کھڑا ہو کر ہم جنس پرستی کے منشور کے پرچارک امیدوار کے لئے ووٹ تو نہیں مانگ سکتا جبکہ ڈونلڈ ٹرمپ کے لئے میں یہ کر سکتا ہوں۔میرے ایک بزرگ امریکی دوست بڑے دکھی انداز میں بتا رہے تھے کہ ان کا پوتا چوتھی جماعت کا طالب علم ہے اور اسکی ٹیکسٹ بک بورڈ کی شائع کردہ کتاب میں یہ سوال ہے کہ وہ بڑا ہو کر مرد بننا چاہتا ہے؟ یا عورت بننے کو ترجیح دے

گا؟ٹرمپ کا وعدہ ہے کہ وہ یہ کتابی نصاب تبدیل کردے گااورایسی خرافات کونصاب سے خارج کردے گا۔

کملاہیرس کی طاقت یہ ہے کہ تمام رنگین لوگ (کلرڈ کا یہ ترجمہ ہی موزوں رہے گا) ترجیحی طور پرڈیموکریٹک پارٹی کوووٹ دیناپسندکرتے ہیں،کالے ،پیلے اور ہم جیسے چاکلیٹی لوگ تعدادمیں ہرآنے والے دن کے ساتھ امریکہ میں بڑھتے چلے جارہے ہیں،اس مسلسل اضافے کوروکنے کی کوشش کاوعدہ کرنے پرڈونلڈٹرمپ کوجہاں دادتحسین مل رہی ہے وہیں اس کی مخالفت میں بھی شدت کے ساتھ اضافہ ہورہاہے۔ایل جی بی ٹی مخفف ہے مگرایک جنسی طور پرمنفرد طبقے کواکٹھا کرنے کاپلیٹ فارم بھی ہے، یہ تمام لوگ بھی کملاہیرس کےووٹر ہیں اوران کااثرونفودامریکہ میں بہت زیادہ ہے۔ٹرمپ کاوعدہ ہے کہ وہ فوج میں LGBT کی بھرتی پرپابندی عائدکردے گا۔اس کےعلاوہ اسقاط حمل پربھی پابندی کاوعدہ اس کے منشورکاحصہ ہے۔

تارکین وطن کے امریکہ میں غیرقانونی طورپرداخل ہونے اورپھرقانونی حیثیت حاصل کرلینے کی مخالفت ڈونلڈٹرمپ کابنیادی انتخابی نقطہ ہےجس پرہمیشہ اس نےمہم جوئی کی ہے۔گزشتہ انتخابات میں اس نے امریکہ اورمیکسیکوکے درمیان دیوارتعمیرکروانے کاوعدہ کیاتھا،جوکہ کئی کلومیٹرمنتخب ہوجانے کے بعداس نےتعمیربھی کروادی تھی۔اس مرتبہ وہ اس دیوارکومکمل کرنے اورمزیداونچاکرنے کی بات کررہاہے۔تارکین وطن کے لئے جہاں ٹرمپ برے الفاظ اورسخت رویہ اپنائے ہوئے ہے،وہیں پرکملاہیرس کایہ کہنا بھی منطقی ہے کہ امریکہ توملک ہی تارکین وطن کاہے۔یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جوموجودہ شکل ہمارے سامنے ہے،اسے توترتیب ہی غیرممالک سے آنے والے لوگوں اوران کی اولادوں نے دیاہے۔یہ بات واقعی عجیب لگتی ہے کہ تارکین وطن کی مخالفت وہ کررہے ہیں جوخودتارکین وطن کی اولاد ہیں۔چونکہ اصل امریکی باشندےتوریڈانڈین تھے جواب کل آبادی کاشائدایک فیصدبھی نہیں بنتے ہیں۔

ڈونلڈٹرمپ کی جانب سے تارکین وطن کی امریکہ آمدپرمخالفت کی مثال بالکل ایسے ہے

جیسے کوئی ریل گاڑی آ کر کسی پلیٹ فارم پر رکتی ہے، تمام ڈبے مسافروں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں، پلیٹ فارم پر منتظر کھڑے لوگ جلدی سے ٹرین کے اندر گھسنے کی کوشش کرتے ہیں اور گاڑی میں پہلے سے موجود مسافر نئے مسافروں کو روکنے کی کوشش میں ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ٹرین پہلے ہی بھری ہوئی ہے۔اس میں تو تل دھرنے کی جگہ نہیں،اس دھکم پیل میں جو لوگ کونیاں مار کر، دائیں بائیں دھکا لگا کر آگے نکل کر گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں،عموماً اگلے ریلوے اسٹیشن پر جب جا کر یہ گاڑی رکتی ہے تو یہی لوگ نئے مسافروں کو سوار ہونے سے روکنے میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں۔

تاریخی طور پر امریکی انتخابات میں عموماً مسلمان اور پاکستانی ڈیموکریٹ امیدواروں کی حمایت کرتے آئے ہیں، ان صدارتی انتخابات کی خاص بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ مسلمان ووٹر بالخصوص اور پاکستانی ووٹر بالعموم دو دھڑوں میں تقسیم ہے۔ٹرمپ کو یہ کریڈٹ بہرحال جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی ایک واضح تعداد کو اپنی حمایت پر آمادہ کر لیا ہے۔

برازیل کا طلسم ہوشربا

ساؤپاؤلوائیرپورٹ پر ملے وہ تین بھائی مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ جن میں سے ایک گوراپکاانگریز لگ رہا تھا، دوسرا ہمارے جیسا دیسی چہرہ، گندمی رنگت اور کھلی کھلی سی آنکھیں۔ تیسرا افریقی نژاد لگتا تھا، گھنگھریالے بال سیاہ رنگت اور چپٹی ناک۔ میں نے بہت کریدا اور اصرار بھی کیا کہ تم تینوں کے درمیان گہری دوستی کا رشتہ ہوگا؟ شاید اسی سبب سے تم ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے ہو؟ زیادہ سے زیادہ تم دور دراز کے کزن ہو سکتے ہو؟ مگر وہ بضد تھے کہ وہ سگے بھائی ہیں، یقیناً وہ سچ بول رہے تھے مگر ایسا صرف برازیل میں ہی ممکن ہے۔ان کے والدین کی فرداًفرداً زندگی کا زائچہ نکالنا ویسے بھی غیر مہذب اور تلخ سازاویہ لگتا ہے۔ ساؤپاؤلو نہ صرف برازیل کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ براعظم جنوبی امریکہ اور شمالی امریکہ کا سب سے بڑی آبادی کا حامل نگر ہے، دو کروڑ سے کہیں زیادہ لوگ یہاں آباد ہیں مگر ائیرپورٹ اس کا چھوٹا سا ہے۔ چودہ گھنٹے کی لمبی فلائیٹ لے کر یہاں پہنچا تھا اور اگلا سفر بھی اتنا ہی باقی تھا۔اس کے درمیان میں چودہ گھنٹے کا ہی ٹرانزٹ آن پڑنے کے سبب معاملہ مزید گھمبیر ہوگیا۔گرچہ ائیرپورٹ میں ٹھہرنے کے لئے کمرے کرائے پر دستیاب ہوتے ہیں، ماضی میں کئی بار میں نے ان میں قیام بھی کیا، چار گھنٹے کے حساب سے یہ کمرے کرایہ وصول کرتے ہیں مگر شومئی قسمت کہ اس بار کوئی کمرہ بھی خالی نہ مل سکا اور انہوں نے بھی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ صاف جواب دے دیا۔

پاکستانی پاسپورٹ پر برازیل میں داخل ہونے کے لئے ویزہ ہونا ضروری ہے جو کہ میرے پاس نہیں تھا مگر ایک موہوم سی امید دل میں یوں تھی کہ میرے پاس چلی کا مستقل سکونتی شناخت نامہ

موجود تھا۔ایک پاکستانی دوست نے بتایا تھا کہ وہ اس شناخت نامے کے ساتھ برزایل کی سیر کر چکے ہیں۔البتہ میرا ذاتی تجربہ اس سے متضاد تھا۔اس کے باوجود فیصلہ کیا کہ چلو شہر میں داخلے کی کوشش کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ امیگریشن کا عملہ انکار ہی کر دے گا، اس عمل سے تھوڑا بہت ٹائم بھی پاس ہو جائے گا۔ پنجابی محاورے کے مطابق اگر بابا مطلوبہ شے نہیں دے گا تو کیا گھر بھی واپس نہیں آنے دے گا۔اسی عزم کے ساتھ سبز پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات لے کر لائن میں کھڑے ہو گیا۔ بین الاقوامی آمد کی امیگریشن پر مامور جس افسر کے سامنے میری باری آئی وہ بڑی مہربان خاتون تھی، وزن تین من کے قریب ہوگا، میں نے دیکھا ہے کہ موٹے افراد زیادہ زندہ دل، انسانیت پرست اور خوشگوار طبیعت کے ہوتے ہیں، خاتون نے میرا مدعا سننے کے بعد کچھ دیر سوچا اور پھر انٹری دے دی۔

ساؤپاؤلو بنیادی طور پر صنعتی شہر ہے۔کراچی شہر کی جو حیثیت ہمارے ملک میں ہے کم و بیش ویسی ہی پوزیشن اس شہر کی برازیل میں ہے۔ لیجئے کیا خوبصورت بات یاد آ گئی کہ جس شخص نے ہمارے دارالحکومت اسلام آباد کا نقشہ اور منصوبہ بنایا ہے اسی آرکیٹیکچر نے برازیل کے دارالحکومت برازیلیا کو تشکیل دیا ہے۔ویسے تو میکسیکو شہر کا ایئر پورٹ بھی اسی نے ڈیزائن کیا ہے مگر بات کسی اور طرف نکل جائے گی۔عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ صنعتی شہر ہونے کے باوجود ساؤپاؤلو کی فضا فنکارانہ اور شاعرانہ ہے۔ایک چوک میں دو نوجوان گٹار بجا رہے ہیں، انگریزی میں ڈوئیٹ اور ہم جسے دوگانا کہتے ہیں وہی انداز ہے، موسیقی کی زبان میں بات کریں تو جگل بندی، کیا مسحور کن فضا بنا رکھی تھی ان نوجوانوں نے، میں ان کے پاس ہی جا کر بیٹھ گیا اور اس وقت تک انہماک سے سنتا رہا جب تک انہوں نے خود بریک نہیں لے لی۔

مجھ سے جتنی تعریف کرنا ممکن تھی میں نے بھرپور انداز میں کر دی۔ سچ بات ہے کہ ان کی موسیقی نے روح کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ہلکی پھلکی گپ شپ ہوئی تو انہوں نے مجھے اپنی سی ڈی تحفتاً پیش کر دی۔ وہ اچھے خاصے معروف موسیقار تھے مگر کھلی فضا میں ریاض کرنے کے لئے یہاں بیٹھے تھے۔ یہ تحفہ کس قیمت کا ہے یہ بات اہم نہیں، اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ کیسے سخی ہیں اور کس

قدر اپنائیت ومحبت سے اجنبی دیس کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یہاں مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا جب شہر میں پیدل چل چل کر تھک گیا اور ہمارے محاورے لور لور پھرنا کے مطابق گلیوں، بازاروں کی خاک چھان کر بدن تھکن سے چور ہو گیا تو ذہن میں کافی پینے کا خیال آیا۔ ہمارے محلوں کی طرح یہاں بھی گھر کے باہر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر منڈلی جمانے کا رجحان عام ہے۔ ایسی ہی ایک گپ شپ میں مشغول خواتین کی جوڑی سے میں نے پوچھا کہ یہاں کوئی کیفے ٹیریا قریب میں ہے؟ مجھ سے خاتون نے پوچھا کہ کیا کافی پینی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا کہ ارادہ تو یہی ہے۔ اس پر کہنے لگی کہ یہاں پر ہی ٹھہرے رہو اور خود مکان کے اندر چلی گئی، یقیناً یہ خواتین محلے دار تھیں۔ چند منٹ بعد وہ خاتون واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں گرم کافی کا مگ تھا، جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کافی مگ مجھے تھماتے ہوئے کہنے لگی کہ تم یہاں کے نہیں لگ رہے؟

ملک، نام، مذہب کچھ بھی پوچھے بغیر اس قدر اپنائیت سے پیش آنے والے مہربان لوگ میں نے دنیا کے اور کسی کونے میں کم کم ہی دیکھے ہیں۔ شہر کے بارے میں اپنے تجربات وسوالات کے بعد میں نے پوچھا کہ یہاں سے ایمازون کا جنگل کتنی دور ہے؟ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے، اس کی سیر کے لئے تمہیں زیادہ دن لے کر آنا چاہئیے۔ ایمازون جنگل اتنا بڑا ہے کہ اگر کوئی انسان اس میں کھو جائے تو پھر دوبارہ کبھی نہیں ملتا۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ یہ مبالغہ نہیں ہے، بالکل حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ قطعاً نہیں کہ یہ خطرناک ہے، اس میں تو زیادہ تر بندر وغیرہ ہی ہوتے ہیں، شیر، چیتے، ہاتھی یہاں نہیں ہوتے۔ اور بندر بھی دنیا کے باقی ملکوں کی نسبت بہت چھوٹی جسامت کے ہوتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں بندر کا بچہ ہوتا ہے۔

آج کل ایک دلچسپ رجحان یہ ہے کہ لوگ ایمازون میں ایک زہریلے مینڈک کا ڈنک مروانے کے لئے آتے ہیں۔ جی ہاں! یہ ایک طرح کا نشہ ہے جو غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے، مگر جنگل میں کہاں کوئی پولیس اور فوج آئے گی، یہ دنیا کا سب سے بڑا جنگل ہے جو کئی ملکوں پر پھیلا ہوا ہے۔ زہریلے مینڈکوں سے ڈنک لگوانے کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے آدمی

خود کو مرتا ہوا محسوس کرتا ہے، حقیقت میں تو یہ نشہ ہی ہے مگر ایک مہربان جو اس تجربے سے گزرے، بتاتے ہیں کہ تمام کیفیات وہی ہوتی ہیں جو مرنے سے پہلے کی ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ آپ کو موت کے دہانے پر پہنچا دیتا ہے۔ آدمی مرتا نہیں ہے مگر موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ میرے اس ممدوح کے نزدیک اس تجربے سے زندگی کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

رات کے پچھلے پہر جب پرواز ساؤ پاؤلو شہر سے اٹھ رہی تھی تو ایسا منظر تھا جیسے کوئی نگری نہیں بلکہ اندھیرے کے سمندر میں روشنیوں کا ایک جزیرہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ سیاہ رات کے جنگل سے بغاوت پر آمادہ چراغوں کا کوئی بازیچہ ہے۔ جو جہاز کی کھڑکی سے نیچے نظر آ رہا ہے، بچپن میں جو کہانیاں سنی تھیں یہ ان کی سرزمین محسوس ہو رہی تھی، یوں لگا جیسے طلسم ہوشربا ابھی ابھی دیکھ کر نکلے ہوں۔

حصہ دوم

کتاب سے برتر کوئی جلیس نہیں

انسان کی تاریخ

یروشلم میں ہبرو یونیورسٹی کے استاد یووال نوح حراری کی کتاب کو عہد ساز کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس لئے بھی کہ پوری دنیا کے علمی افق پر اس نے ایک دہائی سے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اپنی اشاعت کے تین برس بعد عبرانی میں شائع ہونے والی کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ بازار میں پہنچا تو پوری دنیا میں جنگل کی آگ کے محاورے کی طرح پھیل گیا۔ سائنس اور تاریخ کے ساتھ کہانی نویسی کا ایسا خوبصورت امتزاج میں نے آج تک نہیں پڑھا جیسا ''بنی نوع انسان کی مختصر تاریخ۔ سیپینز'' میں مصنف نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے اور اس پر تبصرہ تحریر کرنے کی وجہ یہ قطعاً نہیں ہے کہ اخباری خبر کے مطابق، عمران خان نے جیل میں جن چند کتابوں کا مطالعہ کرنے کی فرمائش کی ہے ان میں یہ کتاب شامل ہے، جو کہ انہیں فراہم کر دی گئی ہے۔ بل گیٹس کا یہ مشورہ بھی باعث تحریر نہیں کہ پانچ صد صفحات کا یہ دلچسپ مطالعہ آپ کو ضرور کرنا چاہیئے۔ اس کتاب کے موضوع کے متعلق ہمارے ایک ادیب دوست نے ایک محفل میں مختصر گفتگو کی تو دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اس لئے کہ جس بنیادی سوال کا یہ کتاب احاطہ کرتی ہے وہ میرے ذہن میں کئی سال تک مچلتا رہا۔

شام کے دارالحکومت دمشق سے کوئی ایک، ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر زبدانی نامی مقام ہے۔ پہاڑیوں کے بیچوں بیچ سفر طے کر کے جب چوٹی پر پہنچتے ہیں تو ایک طرف اسرائیل کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور دوسری طرف اردن کا پہاڑی سلسلہ، یہ سرسبز پہاڑ ہیں جن پر زیتون لہلہاتے ہیں۔ زبدانی کی ایک پہاڑی چوٹی پر حضرت آدم کے فرزند ہابیل کی قبر ہے، جو کہ تاریخ انسان کے پہلے مقتول ہیں۔ اپنے حقیقی بھائی قابیل کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ ہابیل کے مزار کی دیوار پر ایک شجرہ نسب آویزاں ہے۔ یہ شجرہ نسب

حضرت آدمؑ لے کر نبی خاتمؐ تک ہے۔میں نے دیر تک اس شجرے کا مطالعہ کیا۔ایک سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا جس نے پریشان کر دیا۔سوال یہ تھا کہ سائنسی نقطۂ نظر کے مطابق تو کائنات کی ابتداء پانچ ارب سال پہلے ''بگ بینگ'' نامی زوردار دھماکے کے نتیجے میں بیان کی جاتی ہے، جبکہ جو شجرہ بتاتا ہے، اس کے مطابق تو انسانی تاریخ فقط ہزاروں سالوں پر مبنی ہے۔میں نے یہ سوال اپنے شہر کی روحانی شخصیت کے سامنے پیش کیا، اعجاز احمد کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا کی کہ انہوں نے نبی اکرمؐ کی دعائیں جمع کی اور اردو ترجمے کے ساتھ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں اسے شائع کروایا۔وقت کی عدم ہم آہنگی کے میرے سوال کے جواب میں انہوں نے مجھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ فرمان سنایا کہ '' آدم سے پہلے بھی ستر آدم تھے'' یہاں یہ وضاحت بھی برمحل ہوگی کہ عربی زبان میں ستر سے مراد ان گنت یا بے شمار مراد لیا جاتا ہے، جیسے پنجابی زبان میں ''کوتر سو 101 '' کہتے ہیں۔صوفی اسکالر کی بات سن کر میرا دل مطمئن ہو گیا۔خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب یووال نوح حراری کی کتاب نے بھی یہی بات کہی، گرچہ الفاظ تھوڑے بہت مختلف ہیں۔بنی نوع انسان جسے خردمند آدمی بھی کہا جا سکتا ہے، اس سے ملتے جلتے انسانوں کی کئی اقسام تھیں مثال کے طور پر نینڈرتھل، جاوا مین وغیرہ۔یہ تمام دیگر اقسام کے انسان بارہ ہزار پہلے معدوم ہو گئے اور ہم واحد بنی آدم زندہ بچے اور پھلے پھولے۔یہ آخری برفانی دور بھی کہلاتا ہے اور زرعی انقلاب کی ابتداء بھی اسی وقت ہوئی تھی۔

زرعی انقلاب نے انسانی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اور مصنف نے اس کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے، دس ہزار سال پہلے شروع ہونے والا زرعی انقلاب دو ہزار سال پہلے دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گیا۔گندم پہلے فقط مشرق وسطیٰ میں پائی جاتی تھی جبکہ مصنف کے مطابق اب پاکستان کے رقبے سے تین گنا رقبے پر گندم کاشت ہو رہی ہے، دنیا بھر کے ہر کونے میں۔

زراعت کے فن میں آگ نے انسان کی بڑی مدد کی ہے۔مٹی راکھ کی بدولت مزید زرخیز ہو جاتی ہے۔جنگل کی نسبت میدانوں میں شکار کرنا مزید آسان ہو جاتا ہے۔یاد رہے کہ انسان روایتی طور پر ہمہ

خور ہے۔تاریخی اعتبار سے شکاراور جنگلی جڑی بوٹیاں ہی اس کی خوراک ہوتی تھیں۔گندم بھی جنگلی پوداتھا۔جیسے ہی انسان اس سے متعارف ہواتو خمار گندم سر چڑھ کر بولا۔اس نازک اندام پودے کو پتھریلی زمین ناپسند تھی اور دوسری بات یہ کہ اسے ہر غیر ضروری جڑی بوٹیوں سے چڑ تھی۔اس بابت ایک روایت ہے کہ زراعت کی ابتداء گھریلو خواتین نے کی اور مرد شکار کھیلا کرتے تھے مگر زرعی انقلاب نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

پانچ سو سال پہلے صنعتی انقلاب کو بھی مصنف تفصیل سے بیان کرتا ہے۔یووال نوح حریری تاریخ کو ڈرامائی انداز میں بیان کرنے کا ماہر ہے،کہیں وہ تیس کروڑ سال پہلے آسمان سے ایک شہابیے کو زمین پر گرنے کو تمام ڈینوسار کی موت کا سبب بیان کرتا ہے،کسی جگہ نیویارک کی تاریخ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے،کہ ہالینڈ سے آئے نوآبادیاتی قابضین نے ایک جزیرہ شہر بسانے کے لئے چنااور اس کا نام نیوایمسٹرڈیم رکھا۔مقامی ریڈانڈین حملہ آور نہ ہوسکیں،اس خیال سے ایک عظیم دیوار تعمیر کی گئی۔جب سترھویں صدی میں برطانیہ نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اس کان نام تبدیل کر کے نیویارک رکھ دیا۔شہر کی دیوار گرادی گئی اور اس جگہ وال اسٹریٹ تعمیر کر دی گئی،جو کہ آج کل عالمی کاروبار کی ریڑھ کی ہڈی اور سرمایہ دارانہ نظام کا استعارہ ہے۔

مصنف بنیادی طور پر عسکری مورخ ہے۔جنگی مہمات پر اس نے کئی مضامین اور کتابچے لکھے ہیں مگر عالمی شہرت اسے اسی کتاب سے ملی ہے۔درجنوں زبانوں میں ترجمہ ہو کر کروڑوں کی تعداد میں بکنے والی اس کتاب کی حقیقت جان کر میں حیران رہ گیا۔یہ بنیادی طور پر یووال نوح حراری کے ان بیس لیکچرز کا مجموعہ ہے کہ جو وہ اپنی انڈر گریجوایٹ جماعت کو بطور نصاب پڑھاتے ہیں۔اس حقیقت کے آشکار ہونے سے ایک بات تو یہ سمجھ آتی ہے کہ ہمارے اہل قلم کو لکھتے ہوئے یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کا مخاطب انڈر گریجوایٹ طالب علم ہیں،اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی کتاب کی فروخت بھر پور ہو اور اسے عوامی پذیرائی حاصل ہوسکے۔دوسرا پہلو،یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے،اگر اسرائیل کی یونیورسٹیوں میں عمومی معیار تعلیم یہی ہے جو اس کتاب جھلکتا ہے تو پھر یہ انتہائی بلند اور اعلیٰ معیارِ تعلیم ہے۔یووال نوح حریری جیسے

اساتذہ اور بھی اگر وہاں ہیں تو ان کی یہ خوش قسمتی ہے۔صرف یہ یاد دلاتا چلوں کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی کا نام پنجاب یونیورسٹی لاہور ہے، جس کا وائس چانسلر بعض اوقات دس سال تک میٹرک پاس شخص ہوتا آیا ہے۔گرچہ اس کتاب پر ثقہ مبصرین کی رائے منفی اور منقسم ہے مگر یہ بہت سارے نئے سوالات کھڑے کرتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ بے شمار مشکل اور اہم سوالات کے جوابات فراہم کرتی ہے۔

نقشِ فریادی ہمارے عہد میں

بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔عام لوگوں کی عامیانہ گفتگو پر تنقید مقصود نہیں ہے،مگر بڑے انسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عام سے موضوع پر بھی عمومی سی بات کرتے ہیں تو اس میں بھی دانش کا کوئی پہلو نکل آتا ہے۔یہاں یہ وضاحت بھی از بس ضروری ہے کہ میں بڑا آدمی اسے سمجھتا ہوں جو علم وحکمت میں افضل ہو۔مال ومتاع کی فراوانی بڑے پن کے لئے ناکافی سامان ہے۔اس تمہید کا سبب میرے زیرِ مطالعہ ایک تازہ تازہ شائع شدہ کتاب ہے۔اس کتاب کا عنوان انگریزی زبان میں ہے مگر تحریر اردو ہے۔ Facing History With Facebook ایک جدید خیال ہے،متنوع موضوعات پر مشاہیر کی مستند رائے کو جدید پیرائے میں بیان کرنا جیسے وہ تاریخی شخصیات خود فیس بک کی صارف ہوں اور بنفسِ نفیس اپنی رائے پیش کر رہی ہوں۔امجد محمود چشتی ایک منجھے ہوئے لکھاری اور ایک مقبول مزاح نگار ہیں جن کی اب تک متعدد کتب شائع ہو کر سندِ قبولیت حاصل کر چکی ہیں،مگر زیرِ نظر کتاب سب سے خطرناک ہے۔چونکہ مصنف بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں اس لئے تحریر میں شگفتگی بھرپور ہے اور اندازِ بیان بھی انتہائی تخلیقی ہے،موضوعات مگر ایسے ہیں جیسے تنے ہوئے رسے پر چلنا۔ذرا سا توازن بگڑا تو دھڑام ہونے کا ہر دم اندیشہ مگر اس مشکل امتحان میں امجد محمود چشتی یوں سرخرو رہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے تو ایک جملہ بھی کسی موضوع پر بطور رائے رقم نہیں کیا۔جن مشاہیر کی رائے بیان کی گئی ہے وہ تاریخ میں پہلے سے درج اور مصدقہ ہے۔جسے بآسانی ریکارڈ سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔تخلیق کار کی بنیادی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ

ہجوم سے ہٹ کر سوچتا ہے، ان امکانات کا بھی جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے جن پر ان کا عہد ابھی تک غور کرنے پر بھی مائل نہیں ہوتا۔ امجد محمود چشتی نے وہ کام کر دکھایا ہے جہاں مصنوعی ذہانت شائد کئی سال بعد پہنچے کہ کسی مخصوص موضوع پر مشاہیر کی رائے کیا ہے؟ انداز ایسا جاذب نظر اور طرز تحریر اتنا دلچسپ ہے کہ قاری کو جکڑ لیتا ہے اور کتاب مکمل کئے بغیر چھوڑنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ مصنف کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کا عدم تعصب ہے، خاص طور پر مذہبی موضوعات کو قلمبند کرتے ہوئے ان کی یہ خوبی نمایاں نظر آتی ہے۔ مجھے اس کتاب میں مزاح کے ساتھ ساتھ تعلیم کا پرچار اور انسان دوستی بھی چھلکتی نظر آتی ہے۔ مارک زوکر برگ نے فیس بک ایجاد کرتے ہوئے یہ سوچا بھی نہ ہو گا کہ اس کے سماجی رابطے کے لئے بنائے گئے اس فورم کا کوئی سخن ور ایسا تخلیقی استعمال بھی سوچ سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فیس بک ایک آن لائن فورم ہے۔ مگر مصنف نے اس برقی کتاب کو ورقی کتاب میں ڈھال کر ایک نئی جہت متعارف کروادی ہے۔ ساہیوال کے معروف اشاعتی ادارے انور سنز پبلشرز نے اسے انتہائی معیاری کاغذ پر شائع کیا ہے۔ ساہیوال پرنٹنگ پریس نے اعلیٰ طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ جاذب نظر سرورق سامعہ مریم اور تخلیقی لے آؤٹ اختر خان کی محنت ومحبت کا ثبوت ہے۔ محمد عبداللہ چشتی کی نظر ثانی نے اس کتاب کو مزید جلا بخشی ہے۔ تین سو اڑسٹھ صفحات کی اس دلچسپ کتاب کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ کتاب اپنے خریداروں کو مایوس نہیں کرے گی۔ میری اس رائے کی وجہ سخن فہمی کے علاوہ غالب کی طرفداری بھی ہوسکتی ہے۔ چونکہ مصنف کا اور میرا آبائی علاقہ ایک یعنی میاں چنوں ہے۔ تفنن برطرف، موضوعات کا ایسا تنوع آپ کو آج کل کے تخلیق کاروں میں کم کم ہی نظر آئے گا۔ حیات غالب اور ذکر اقبال سے بات شروع کرتے ہیں۔ وارث شاہ اور امرتا پریتم سے ہوتے ہوئے محی الدین ابن عربی اور مولانا طارق جمیل تک موضوع سخن نظر آتے ہیں۔ کتاب میں درج کی گئی بحث کے عنوانات انتہائی دلچسپ ہیں، مسائل تصوف، انسان اور کائنات، خوابوں کا بیان، حقوق نسواں۔ غرض کہ نظریہ وحدت الوجود سے لے کر بیانات حور تک ایک قوس قزح ہے جو نمودار ہوتی

نظر آتی ہے۔مصنف کی بزلہ سنجی اور فنکارانہ مہارت قابل داد ہے۔مگر مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ خوبی کہ تعصب اور نفرت کی ایک جھلک بھی اس تحریر میں نظر نہیں آتی۔اس نفسا نفسی کے دور میں انسان کا اپنی بچوں جیسی شرارت اور معصومیت و حیرت کو برقرار رکھنا ایک کرشمے سے کم نہیں ہے اور مصنف اس امتحان میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔یہ کتاب اردو ادب کے دامن میں ایک خوشگوار اضافہ ہے اور اہلِ وطن کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔جس طرح اچھی جسمانی صحت کے لئے اچھی خوراک ضروری ہے، بالکل ویسے ہی ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے اچھی کتاب اور مثبت علم ضروری ہے، چونکہ انہی سے پھر مثبت سوچ جنم لیتی ہے جو کہ ایک اچھے معاشرے کی بنیاد ہے۔

سخن ور کا سفر نامہ

پاکستان کے ایک معروف قانون دان اور سابق وفاقی وزیر کو میں نے ایک بار مشورہ دیا کہ انہیں اپنی آپ بیتی تحریر کرنی چاہیے۔ وجہ اس کی یہ امید تھی کہ مذکورہ آپ بیتی ہمارے ملک کی تاریخ کی آئینہ دار ہوگی اور بہت سارے قومی اہمیت کے موضوعات پر دیانتدارانہ خیالات سے قارئین استفادہ حاصل کر سکیں گے۔ انہوں نے میرے مشورے پر عمل کرنے کی یقین دہانی کروادی مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک جملہ معترضہ بھی بیان کر دیا۔ وہ نقطہ یہ ہے کہ ہم پاکستانی بحثیت قوم ریکارڈ رکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ یورپ میں ایک آدمی صدیوں پہلے آسمان پر ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے تو اسے ریکارڈ پر لے کر آتا ہے اور جب کئی عشروں بعد پھر اسی مقام پر جب تارہ ٹوٹتا لوگوں کو نظر آتا ہے تو وہ اس ریکارڈ کو تحریر میں لاتے ہیں اور صدیوں پر محیط یہ عمل مسلسل بار بار دہرائے جانے سے بالآخر نظام فلکیات میں ایک نئی حقیقت اور انکشاف کو جنم دیتا ہے۔ جبکہ برصغیر پاک و ہند میں اگر آپ اس خطے کی تاریخ پر کوئی مستند کتاب کھوجنے جائیں تو ایک صدی پیچھے جانے کے بعد مشکل سے ہی کوئی معتبر تاریخی کتاب نظر آئے گی۔ ایسے عالم میں جب میں نے یونس وریام کا تازہ سفرنامہ ''حوریں زمین پر'' پڑھنا شروع کیا تو اس کتاب کے پہلے باب کے ابتدائی حصے نے ہی مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ وہ خوبصورت اور قیمتی بات یہ تھی کہ اس سفرنامے کو تحریر کرنے کی بنیادی وجہ مصنف کا یہ خیال تھا کہ وہ اپنی زندگی میں دنیا بھر میں جہاں جہاں گھومنے پھرنے یا پھر کام کاج کے سلسلے میں بھی عازم سفر ہے ہیں، اگر وہ سفرنامے کی صورت میں صفحہ قرطاس پر بکھیر دیں تو اس سے بہت سارے ہم وطنوں کا بھلا ہوگا۔ یہ سوچ میرے نزدیک نیکی پر مبنی ہے کہ کوئی اس خاطر قلم اٹھائے کہ اس سے

دوسروں کا بھلا ہونے کی توقع ہے۔سفر کے اپنے تجربات واحساسات کوقلم بند کر کے یونس وریام نے ادب کی بے پناہ خدمت کی ہے۔

فرانس کے بارے میں ایسا جاندار، پرمغزاوروقیع سفرنامہ میں نے آج تک نہیں پڑھا ہے۔جن جزیات کا مصنف نے ذکر کیا ہے وہ عمومی طور پر سفرنامہ نگاروں کے ہاں موضوع گفتگو ہی نہیں ہوتی ہیں۔یونس وریام نے اپنی حقیقت پسندی اورحق بیانی سے اس کتاب کے ذریعے مجھے تواپنا گرویدہ بنالیا ہے۔حوریں زمین پر کہیں نجی روزنامچہ کے روپ میں نظرآتا ہے تو کہیں الف لیلوی داستان لگتا ہے۔کئی جگہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی خالصتاً ادبی مضمون پڑھ رہے ہیں،توکسی جگہ فکاہیہ محسوس ہوتا ہے۔ایک اچھے سفرنامہ نگارکی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اس میں تمام اصناف ادب کوسمودیتا ہے۔یونس وریام بھی ایک ایسے ہی نابغہ روزگار مصنف ہیں۔شعروسخن سے نسبت کے سبب موقع محل کی نزاکتوں کے مطابق شعری چاشنی سے ''حوریں زمین پر'' کوچار چاند لگاتے نظرآتے ہیں۔

میئرآف پیرس کی شمپین پارٹی اوردیگر کانفرنسز پرابواب بڑے خوبصورت انداز میں باندھے گئے ہیں۔جنرل چارلزڈیگال کے متعلق دومضامین ہیں اوردونوں ہی بڑے پرمغز ہیں۔شانزے لیزے پرباب توآپ کواپنی گرفت میں لے لیتا ہے،جس محبت اورخوبصورتی سے اسے تحریرکیا گیا ہے۔لیڈی ڈیانا کے مقام وفات کی سیاحت پرلکھا گیامواد قارئین کی دلچسپی کا یقیناً باعث ہوگا۔پیرس کا امتیازی نشان ایفل ٹاوراپنے شکوہ اورجلال وعظمت کے ساتھ ساتھ محبت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی محسوس ہوتا ہے جب اس کی بابت آپ پڑھتے ہیں۔پیرس کا ماضی،حال ومستقبل اورجغرافیائی خدوخال بیان کرتے ہوئے مصنف نے کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

اس سفرنامے کو پڑھ کرمیرا یونس وریام کے بارے میں یہ تاثر گہرا ہوا ہے کہ ان کوادب کے ساتھ ساتھ تاریخ اورجغرافیے کے ساتھ خصوصی لگاؤ ہے،ان کی تحریرمیں لوک دانش چھلکتی ہے۔میرے نزدیک ایک اچھے سفرنامہ نگار کے لئے یہ رخت سفربھی ہے اورضروری خوبی بھی،جوکہ جگہ جگہ ''حوریں

زمین پر'' میں آشکار ہوتی ہے۔اردو زبان کے معیاری سفرناموں میں یونس وریام نے حوریں زمین پر کے ذریعے ایک خوبصورت اضافہ کیا ہے۔جس پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔جس سادگی،سلاست اور ایمانداری کے ساتھ انہوں نے اپنے تجربات اس نیت کے ساتھ تحریر کئے ہیں کہ ان سے مصنف کے ہم وطنوں کو آسانی ہوگی،اس کے لئے میں ان کا شکرگزار ہوں۔حوریں زمین پر جیسی کتابوں کی پاکستانی قوم کو بہت ضرورت ہے۔

دوسو چالیس صفحات پر مبنی اس کتاب کو اعلیٰ آفسٹ کاغذ پر معیاری طباعت کے ساتھ لاہور کے ادارے نستعلیق پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔اس جہت ساز سفرنامے کی قیمت 900 روپے ہے جو کہ آج کے دور کی مہنگائی کو ذہن میں رکھیں تو مناسب ہی محسوس ہوتی ہے۔سرورق انتہائی تخلیقی اور جاذب نظر ہے۔ویسے تو ہم اہل قلم پر الزام ہے کہ عموماً ماضی پرست واقع ہوئے ہیں،مگر سچی بات تو یہ ہے کہ ماضی میں اتنی خوبصورت اور معیاری کتابیں کم از کم لاہور سے شائع نہیں ہوا کرتی تھیں،جتنی دیدہ زیب اور دلکش کتب آج کل چھپ کر بازار میں آرہی ہیں۔

قوس قزح کے رنگوں سے مزین تخلیق کار

خالد سہیل کی شاعری ہماری دھڑکنوں کی ہم نوائی کرتی محسوس ہوتی ہے۔طلسماتی انداز میں یہ قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔1968 سے دو ہزار اٹھارہ تک کی نصف صدی کے شعری سفر کو خواب درخواب میں پیش کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ انتخاب شاعری ہے جو خالد سہیل کے چار شعری مجموعوں سے کیا گیا ہے۔ تلاش اور آزاد فضائیں کے علاوہ خواب نگر اور ادھورے خواب اس شعری انتخاب کا حصہ ہیں۔خالد سہیل خود کینیڈا میں مقیم ہیں،مشرق سے مغرب میں جا بسنے کا سفر،ہجر کے کرب سے ہجرت کے کرب تک کا سفر کہا ہے۔شاعر دلپذیر نے اسے ان کی شاعری میں نوسٹلجیا کا دکھ زیادہ ملتا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا سکھ جسے وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

نئے مقام پہ محبوب بھی نئے پائے
جزائیں ملتی رہیں ہیں ہمیں یہ ہجرت کی

وہ خود کو سچ کی تلاش میں نکلا ہوا مسافر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر سچا فنکار سچ کی تلاش میں نکلا ہوا مسافر ہی ہے۔خواب درخواب میں شامل چاروں شعری مجموعوں کے انتساب متاثر کن ہیں۔ پہلے مجموعے تلاش کا انتساب انہوں نے انسان کے نام کیا ہے۔ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں اصناف ہی خوبصورتی کا پیکر ہیں مگر ان کا حقیقی تخلیقی جوہر نظم میں کھلتا ہے۔آزاد فضائیں میں شامل کئی نظمیں مزاحمتی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔خواب نگر میں شامل قطعات وفردیات کا علاوہ نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔غزلیات اور آزاد نظموں کے ساتھ پابند نظمیں جب نثری نظموں کے ساتھ نظر آتی ہیں تو یہ قوس قزح کے رنگوں کا منظر پیش کرتی ہیں۔

ادھورے خواب میں خالد سہیل کا شعری ہنر اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔اس اس کتاب کی ایک خوبصورت بات اس میں شامل فن مصوری کے نمونے بھی ہیں جو شعری مناسبت کے ساتھ شامل کئے گئے ہیں۔گزشتہ نصف صدی کا غالب حصہ انہوں نے کینیڈا میں گزارا اور اس دوران مسلسل تخلیقی عمل میں مصروف رہے ہیں۔ان کی ستر کے قریب کتب ان کے شوق کی فراوانی اور لفظوں کے ساتھ کمٹمنٹ کا واضح ثبوت ہیں۔پانچ سو صفحات کے قریب خواب در خواب کے اوراق پر خواتین کے حقوق پر کی گئی شاعری اور ان کے حق میں اٹھائی گئی آواز کا تذکرہ کئے بغیر یہ مضمون ادھورا ہے۔نظم ملاحظہ فرمائیں جو گھریلو تشدد کے بہیمانہ عمل کے متعلق ہے۔

اپنی کوکھ میں اپنے بچے
کی چھوٹی سی لاش اٹھائے
زندہ ہوں پر قبر بنی ہوں
اس نے ٹھوکر مار کے کل شب
میرے خواب اور میرے بچے
دونوں کو ہی قتل کیا ہے

موضوعات کے تنوع کے باوجود خواب در خواب کا بنیادی موضوع محبت ہی ہے۔خالد سہیل کی شاعری اردو ادب میں ہمیشہ یاد رہنے والی شاعری میں شامل ہے۔انسانی نفسیات اور جذبات کا اس درجہ درست تجزیہ اور شعری اظہار بہت کم تخلیق کاروں کو نصیب ہوتا ہے۔

چڑھتے سورج کی سرزمین کا ذکر

بینا گوئندی نے تمام عمر پرورش لوح و قلم میں گزاری ہے اور اب بھی ادب کی ترویج کے لئے سرگرداں ہیں۔ تمام اصناف سخن میں گراں قدر حصہ کتب کی صورت میں ڈالا ہے۔ سفرنامہ ادب کا وہ خوبصورت پہلو ہے جس میں کئی دیگر اصناف سما جاتی ہیں۔ جاپان کے بارے میں بینا گوئندی کا یہ سفرنامہ کئی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے، اس امتیاز کی بہت ساری وجوہات ہیں، سب سے اہم بات اس بابت یہ ہے کہ وہ خود ایک منجھی ہوئی لکھاری ہیں اور لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریر میں روانی اور شستگی قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ کتاب ختم کرنے سے پہلے اسے ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ جاپان دنیا کا پہلا اور واحد ملک ہے جس پر ایٹم بم گرایا گیا، لاکھوں لوگ چشم زدن میں لقمہ اجل بن گئے، ان گنت ہمیشہ کے لئے اپاہج ہو گئے اور دہائیوں بعد تک اس کے ایٹمی تابکاری کی صورت میں مضر اثرات کا عوام کو سامنا رہا۔ بینا گوئندی نے اس بارے میں ''ہیروشیما کے آنسو'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ دل میں اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں تو اسے امن عالم کی خواہش گردانتا ہوں۔ یہاں مجھے لاطینی امریکہ کے لافانی انقلابی کردار چے گویرا یاد آ گئے، جنہوں نے ہیروشیما سے اپنی بیٹی کو جو پوسٹ کارڈ بھیجا اس پر لکھا تھا کہ امن سے محبت رکھنے والے ہر شخص کو زندگی میں ایک بار یہاں ضرور آنا چاہیئے۔ اے میوزیم یاد دلاتا ہے کہ ایٹمی اسلحہ کس قدر انسانیت کے لئے تباہی لانے کی صلاحیت رکھتا ہے، پھر ناگاساکی کے بارے میں بڑا پر درد بیان ہے۔ یہاں ایک تاریخی حقیقت کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دونوں شہروں میں کوئی ایک بھی امریکی جنگی قیدی POW موجود نہیں تھا۔

بنیادی طور پر مصنفہ چونکہ تخلیق کار ہیں اس لئے ان کا انداز تحریر بھی انتہائی تخلیقی ہے جس کا اظہار پہلے باب کے عنوان سے ہی ہو جاتا ہے۔ ''چیکو منگمل کا خون'' میں انہوں نے جاپانیوں کے چینی ،کوریائی، منگول اور ملائی حسب نسب اور لسانی ماخذ کا خلاصہ بیان کیا ہے اور ''چیکو منگمل'' کی اصطلاح ان کی اپنی ایجاد کردہ ہے، جو کہ مجھے تو بھلی لگتی ہے۔ فنکار چونکہ بنیادی طور پر حساس ہوتا ہے، اسی حساسیت کے باوصف بینا نے جاپانی سماج کی وہ باتیں، رویے اور طرز چند دنوں کے قیام میں ہی محسوس کر لئے جن کو سمجھنے میں یہاں عمومی رہائش پذیر ہمارے ہم وطنوں کو برس ہا برس درکار ہوتے ہیں۔

سفر کی جزیات یہاں بیان کرتے ہوئے صاف لگتا ہے کہ ان کا مقصد قاری کو مرعوب کرنا یا شیخی بھگارنا نہیں بلکہ ان کے لئے سہولت پیدا کرنا اور سیکھانا ہے۔ یہی سبب سفر کی مشکلات بیان کرنے کا مقصد لگتا ہے کہ

سفر میں دھوپ تو ہوگی جو چل سکو تو چلو

مذہب سے لے کر جغرافیے تک کوئی ایسا پہلو شائد ہی جاپانی سماج کا ہوگا جس پر کچھ نہ کچھ تحریر موجود نہ ہو، تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شرکائے سفر کا تعارف اس بے ساختگی کے ساتھ کرایا گیا ہے کہ قارئین کے ان سے بھی اپنائیت محسوس ہوگی۔ ٹوکیو کے معروف علاقے گنزا کا ذکر پڑھا تو یوں لگا کہ اشرافیہ کے اس مہنگے علاقے کو بینا گوئندی برسوں سے جانتی اور پہچانتی ہیں۔ گہری مطالعاتی نظر کے ساتھ ساتھ افسانوی طرز تحریر ہے جو اس سفرنامے کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ جاپان کی طرف سفر کرنے والے پاکستانی ہم وطنوں کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ وہ رخت سفر میں اس کتاب کو بھی ساتھ رکھیں گے تو ان کو جاپان میں قیام کے دوران کئی آسانیاں میسر آئیں گی۔ تاریخی طور پر جن کے پاس قلم ہوتا تھا ان کے پاس سفر کے وسائل نہیں ہوتے تھے اور جن کو سفر کے وسائل دستیاب تھے وہ اہل قلم نہیں ہوتے تھے، یہی سبب ہے کہ حکیم سعید کے جاپان کے بارے سفرنامے سے لے کر امجد اسلام امجد کے ''چلو جاپان چلتے ہیں'' تک چند ایک ہی معیاری سفرنامے اس ملک کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ اب جبکہ بینا گوئندی جیسے اعلیٰ لکھنے والے جو صاحب ثروت بھی، جب سیاحت کے لئے نکلتے ہیں تو سفر کی سوغات اس جیسے خوبصورت

سفرنامے کی صورت میں ہمارے حصےّ میں بھی آجاتی ہے، جس کے لئے سپاس گزار ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کے قلم کی روانی یونہی قائم ودائم رہے اور علم کے موتی بکھیرتی رہے۔ جاپان کے سفرنامے کی اشاعت پر میں انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور پرامید ہوں کہ قارئین کو بھی یہ بے حد پسند آئے گا۔

گمنام ہیروز کے نام

مؤرخین لکھتے ہیں کہ جنگیں لڑنے والے تو ہمیشہ سپاہی ہوتے ہیں جبکہ جنگوں کے تذکرے میں ہیرو بادشاہ اور جنرل قرار پاتے ہیں۔ہم کہ ٹھہرے اجنبی کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں افضل محمود نے جدوجہد آزادی کے عام سپاہی اور کارکن کی بات کی ہے۔انتساب غریب عوام اور دھرتی سے محبت کرنے والے تابندہ شاعر فیض احمد فیض کے نام کیا گیا ہے۔فیض صاحب کے الفاظ میں ہی بیان کروں تو یہ تیرہ کہانیاں ان شخصیات کی ہیں جن کے بارے میں ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' کا عنوان صادق آتا ہے۔کتاب میں شامل تیرہ افراد کی کہانیاں الگ الگ ہیں مگر قیام پاکستان کے وقت 1947 میں ان میں سے چاہے کوئی نوجوان تھا کہ اپنے بچپن میں، باقی کی تمام عمر نابغۂ روزگار نے نئے تشکیل پانے والے ملک کی تعمیر وترقی میں بسر کردی۔یہ ایثار اور جذبۂ تعمیر ان تمام نادرونایاب لوگوں میں قدر مشترک تھی۔یہ معماران وطن کی قصے ہیں۔

افضل محمود نے جس جس خاندان کی کہانی بھی بیان کی ہے وہ دل کو چھو لینے والی ہے کہ تقسیم نے مذکورہ خاندان کو کیسے متاثر کیا؟ اسکیچ کے نام سے ان کے خاندانی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے حقیقی زندگی کے ان کرداروں کا ذکر کیا ہے۔جن سے براہ راست معاملات پیش آئے۔وہ کسی سیاسی پراپیگنڈا سے متاثر نہیں ہیں۔پانچ سال تک اپنی شوگر اور بلڈ پریشر کو چھپا کر رکھنا کہ والدہ کو پتہ چلا تو انہیں تکلیف ہوگی، یہ سن کر کہ ان کا بیٹا بیمار ہے، بلاشبہ اس واقعے سے ہمیں ایک احساس اور نرم دل انسان کا پتا چلتا ہے۔حساسیت ہی وہ بنیادی شرط ہے جو کسی تخلیق کار کو تخلیق پر آمادہ کرتی ہے۔

ایک خوبصورت پہلوان کہانیوں کا یہ ہے کہ یہ کسی ایک مخصوص علاقے کی

کہانیاں نہیں ہیں بلکہ بلکہ برصغیر کے کونے کونے سے متعلق ہیں۔مصنف نے روداد رقم کرتے ہوئے مختلف پس منظر کے حامل افراد سے گفتگو کی ہے اوران کی کہانی بیان کی ہے مگر قدرے مشترک ان سب میں مسلسل محنت اور جوش نمو ہے۔انتہائی محدود وسائل اور مشکل معاشی حالات میں جس طرح ان کہانیوں کے کرداروں نے جفاکشی اور جدوجہد سے اپنا سفر طے کیا وہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے۔جس سادہ دلی اور مثبت سوچ کے ساتھ پاکستان کی اس پہلی نسل نے نئی تشکیل پانے والی ریاست کی بنیادوں کو مضبوط بنایا وہ قابل ستائش اور قومی سطح پر اعتراف کی متقاضی ہے۔گرچہ ان معماران کو تو نہ صلے کی تمنا تھی اور نہ ہی ستائش کے خواہش مند مگر زندہ قومیں اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کیا کرتیں، میں مصنف کی اس تجویز سے صدفیصد متفق ہوں کہ ان احباب کے نام پر سڑکوں اور عمارات کے نام رکھنے چاہیئں۔سرکاری اداروں کو ان عظیم شخصیات سے منسوب کرنے کا مقصد ان ہستیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان کی قربانیوں اور جدوجہد سے روشناس کروانا بھی ہے۔

آپ بیتی کے رنگ میں پیش کردہ یہ کہانیاں اردو نثر کا عمدہ اور معیاری نمونہ ہیں۔افضل محمود چونکہ ایک مقبول مصنف ہیں اس لئے رواں دواں لکھنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے، جب وہ اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ایسے سچے اور کھرے معماروں کی تعمیر کردہ بنیادوں کے باوجود افسر شاہی ، جاگیرداری، رسہ کشی، رشوت کی دیمک نے چاٹ کر عمارت کو کھوکھلا کر دیا،خزانہ بھرنے کی بجائے قومی خزانہ لوٹنے والوں نے ریاست پر قبضہ جما لیا تو دکھی دل کے ساتھ ان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔سب سے خوبصورت بات جو مجھے ہم کے ٹھہرے اجنبی کے مطالعے سے محسوس ہوئی وہ مصنف کی رجائیت پسندی ہے۔مشکل حالات اور بہت سارے ملک وقوم کو درپیش مسائل کے باوجود وہ پاکستان کے روشن مستقبل کے لئے پرامید ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ مگر وہ ماضی کے ان گمنام ہیروز کی بھی ہمیں یاد دلانا چاہتے ہیں جن کے دم قدم سے آج ہم ایک آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں، اس ملک کی بنیادیں جن لوگوں نے اپنے خون پسینے سے کھڑی کیں، میرے خیال میں یہ کتاب خود ان کی

عزت وتکریم کا باعث ہے اوران کی قربانیوں کا اعتراف ہے۔افضل محمود کی یہ کہانیاں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہیں جس نے ادبی اورسماجی فضا کو معطر کردیا ہے۔اس عظیم کام کوسرانجام دینے پروہ بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

فارسی ادب کے سات سورما

روس کی برف میں گھرے لوگوں کی زندگی مشکل اور تلخ تھی۔گرمیوں کا موسم مختصر ہوتا تھا،ابھی کہیں اور جا بسنے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہوتی کہ دوبارہ آسمان سے برف گرنا شروع ہو جاتی۔اس ماحول میں جمشید پیدا ہوا،قوم نے اسے معتبر جانا اور اپنا سردار چن لیا۔جمشید نے سائبریا سے نکلنے کے اپنے عزم کا اظہار کیا اور اپنی قوم سے کہا کہ دو برس وہ اپنا سامان اکٹھا کریں گے۔تیسری سردیوں کا اختتام ہوتے ہی رخت سفر باندھا اور وہ ان دیکھی منزل کی طرف چل پڑے۔ہارورڈ اور ویانا یونیورسٹیز کی مشترکہ حالیہ دو سالہ تحقیق کے نتائج بتاتے ہیں کہ روس کے جس علاقے سے مذکورہ ہجرت ہوئی وہ سائبریا نہیں بلکہ زیریں وولگا تھا۔چھ ہزار سال پہلے یہ قافلہ چلتے چلتے ایران پہنچ گیا اور تخت جمشید کے نام سے ان لوگوں نے نیا شہر بسایا۔ان لوگوں کا ایمان تھا کہ جمشید پیغمبر خدا ہے۔اپنا مذہب اور زبان یہ لوگ ساتھ لے کر آئے تھے،جو کہ''اوستا''تھی۔اسی سے فارسی زبان نے جنم لیا،بلوچی،پشتو تو دختران فارسی کہلاتی ہیں۔تمام پروٹو ہندیورپی زبانیں اسی چشمے سے پھوٹی ہیں،تاریخ میں ان لوگوں کو''آریہ''کہا جاتا ہے،مگر اس وقت ہمارا موضوع ان لوگوں کی زبان اور اس کا ارتقاء ہے۔ہندسندھ میں بسنے والے آٹھ کروڑ برہمن اور ہٹلر کے نازی نظریات آریائی نسل کے متعلق اہم باتیں ہیں لیکن یہاں یہ تذکرہ زیادہ اہم ہے کہ''اوستا''سے پیدا ہوئی فارسی اور ہندیورپی زبانوں کے رسم الخط تبدیل ہوتے رہے۔فارسی بہت عرصے تک خطِ میخی میں لکھی جاتی رہی۔سائرس اعظم نے ہجرت کر کے آنے والے ان لوگوں کو دنیا کا حاکم بنا دیا،ایک ایسی سلطنت قائم کی جس کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔تمام مشرق وسطیٰ،یورپ اور معلوم دنیا تک اس کا راج تھا۔دارا جیسے جری بہادر تخت جمشید پر بیٹھتے تھے،دارا اپنی آخری جنگ میں اسکندر اعظم سے شکست کھا گیا۔الیگزینڈر ردی

گریٹ کو ہم سکندر اعظم اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی ایرانی بیوی اسے ''اسکندر'' کہتی تھی۔

عرب فاتحین آئے تو وہ ''پ'' کہنے سے قاصر تھے۔اسی سبب سے پارسی زبان فارسی ہوگئی۔خط میخی منسوخ کر دیا گیا اور عربی کا رسم الخط رائج ہوگیا۔مقامی مذہب کی جگہ اسلام نے لے لی۔اس کے بعد کی ایک صدی کو فارسی ادب میں خاموشی کی صدی کہا جاتا ہے۔پھر فردوسی کا جنم ہوتا ہے جو ''شاہنامہ'' لکھ کر اپنی قوم کی تاریخ اور اساطیر کو محفوظ کر دیتا ہے۔مخالفین سرکاری دربار میں اسکی شکایت کرتے ہیں کہ یہ عربی جنگجوؤں کو کاکروچ لکھتا ہے اور عجمی جوانوں کو شیر سے تشبیح دیتا ہے۔فردوسی وہ کام کر جاتا ہے جو شاید بڑے سے بڑا ایرانی لشکر بھی نہیں کر سکتا تھا،وہ شعروں کی صورت میں اپنی قوم کی ثقافتی تاریخ کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر گیا۔مشہد سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر طوس میں فردوسی کے مقبرے کے اردگرد کئی ایکڑ کا خوبصورت باغ قائم کیا گیا ہے۔۔سفید سنگ مرمر کے مزار پر اس کے مقبول اشعار درج ہیں اور سنگ تراشوں نے کمال مہارت سے اس کی شاعری کے کرداروں کو پتھروں میں تراشا ہے۔ایک دیوقامت مجسمہ فردوسی سے منسوب ہے جس پر درج اشعار اپنی تہذیب اور قوم پر فخر کا بیان محسوس ہوتے ہیں۔

شیراز میں پیدا ہوئے تین لافانی شعراء حافظ،سعدی اور عرفی ایسے نام ہیں جن کا چہار دانگ عالم چرچا ہے۔ان کی زندگیاں مگر ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھیں۔سعدی شیرازی ساری دنیا گھوما اور حافظ شیرازی کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکلا تھا۔کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے سفر کا ارادہ باندھا مگر اپنے گاؤں کی بیرونی سرحد سے ہی واپس پلٹ کر آ گیا اور پھر کبھی کہیں باہر جانے کا ارادہ بھی نہیں فرمایا۔

حافظ چونکہ ثمر قند اور بخارا کبھی گئے ہی نہیں تھے اس لئے ان کو ترک شیرازی خاتون کے چہرے پر کالے تل کے بدلے یہ دونوں شہر بخش دینے میں زیادہ تردد نہیں تھا۔

اگر آن ترک شیرازی بہ دست آرد دل مارا

بہ خال ہندویش بخشم سمرقند و بخارارا

حافظ کے عہد میں ایران ترک علاقوں پر اکثر حملے کرتا تھا اور ترک غلام،لونڈیاں بازار میں فروخت کے لئے لائی جاتی تھیں۔کیمونسٹ اور بائیں بازو کی سوچ رکھنے والے ادیبوں،دانشوروں میں عرفی کیوں اتنے مقبول

ہیں؟ مجھے اس بات کی ابھی تک ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی۔ وجہ شاید حضرت علیؓ کے مزار پر کئی دن تک قیام کا واقعہ اور درجنوں ان کے حضور منقبت کے اشعار اس مقصد کے تحت کہنا کہ ان کی زیارت نصیب ہو جائے گی، پھر نامراد گھر لوٹتے ہوئے عرفی کا یہ شعر کہنا ''امام ہونا ایک بات ہے اور با ذوق ہونا دوسری بات ہے'' جو زبان زد عام ہو گیا۔ حالانکہ عرفی تائب بھی ہو گیا اور سینکڑوں اشعار حضرت علیؓ کی شان میں توبہ اور کفارہ کے طور پر کہے، چونکہ اس کا خیال تھا کہ اس نے گستاخی کی ہے، جس کی سزا اسے چہرے پر چیچک اور بیماری کی صورت میں مل رہی ہے۔ نیشاپور میں عمر خیام کا مزار اس دنیا میں میری پسندیدہ ترین عمارتوں میں سے ایک ہے، کھلی چھت والے اس مقبرے میں لیٹے شاعر نے فقط اپنے عہد کو ہی متاثر نہیں کیا کہ وہ ستارہ شناس، ریاضی دان، سیاست کار اور سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صوفی شاعر کے طور پر شہرت رکھتا تھا، اس کی شاعری میں شراب کا تذکرہ ایک استعارہ ہے مگر مغرب کے لوگ بضد ہیں کہ اسے لفظی معنوں میں ہی لیا جائے، اگر کہوں کہ فارسی ادب میں سے عمر خیام اور رومی مغرب کے پسندیدہ ترین شعراء ہیں تو یہ مبالغہ آرائی نہیں ہوگی بلکہ حق بیانی ہے۔ رومؔی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے، مغربی ثقافت چونکہ مشرق سے کئی لحاظ سے بے حد مختلف ہے اس لئے وہ اپنے ثقافتی پس منظر میں ہی ان عہد ساز شعراء کی تفہیم کرتے ہیں۔ اہل مغرب گرچہ رومی سے محبت بے پناہ کرتے ہیں مگر وہ ہم جنس پرست تنظیموں کے پوسٹر بوائے بھی ہیں۔ مولانا شمس تبریزی سے روحانی تعلق سمجھنے سے قاصر ہیں گزشتہ دنوں امریکہ گیا تو ایک مے خانے کا بورڈ دیکھ کر ٹھٹھکا ''خیام''، تجسس سے مغلوب ہو کر اندر گیا تو عمر خیام کی رباعیات دیواروں پر درج دیکھیں، مزید کریدنے پر پتہ چلا کہ اس شراب خانے کا مالک آسٹریلیا سے تعلق رکھتا ہے اور فزجیرالڈ کے خاندان میں سے ہے جس نے خیام کا انگریزی ترجمہ کیا۔ جامی کی نعت میری پسندیدہ ہے اور شاید آپ کو بھی پسند ہو، اسلامی ادب کی تاریخ میں اس سے خوبصورت نعت کم کم ہی دستیاب ہوگی۔ اس کی وجہ شاید جامی کا رسول کریمؐ سے عشق تھا۔ اہل سلوک سے سنا ہے کہ حضور پاکؐ نے حجاز کے حاکم کو خواب میں آ کر کہا تھا کہ جامی کو میرے مزار پر آنے سے روک دو، جامی ارادہ رکھتے تھے کہ اپنی تازہ نعت رسول اکرمؐ کے مزار پر حاضر ہو کر سب سے پہلے انہیں سنائیں گے۔ مگر سرکار دو عالم نے عالم رویا میں حاکم

مدینہ کو خبردار کیا کہ مجھے خود اس امتی کا استقبال کرنا ہوگا اگروہ میرے مزار پر حاضر ہوتا ہے اور نعت ہدیہ کرتا ہے۔

یہ فارسی ادب کے سات شعراء، سات سورما ہیں جن کا عجم میں کیا پورے عالم میں کوئی متبادل تلاش کرنا مشکل ہے۔ادب کا طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب میں تو کوئی بھی شاعر ان کی گرد تک بھی نہیں پہنچا۔ ہفت زبان اور مترجم ہونے کے ناطے مختلف عالمی زبانوں کے شعراء کو پڑھنے کا موقع میسر آیا، بلا مبالغہ ان سات فارسی شعراء جیسا مجھے کوئی بھی شاعر کسی دوسری زبان میں نہیں ملا، ان کی علمی عظمت کا جو مقابلہ کر سکے۔ان کی شاعری سے تو ایک عالم آشنا ہے مگر ان ادبی نابغوں کے حالات زندگی ہماری کتابوں میں نہیں ملتے۔کتاب سے محبت کرنے والے ہر شخص کو صاحب کتاب سے نسبت ہوتی ہے اور ہر اچھا شعر سننے کے بعد شاعر کا خیال آتا ہے۔ہماری بدقسمتی رہی کہ اردو زبان میں ان تمام شعراء کی شاعری تو دستیاب ہے مگر ان کے حالات زندگی ہماری قوم سے اوجھل ہیں، فارسی ،انگریزی، ہسپانوی، روسی میں تو ان عہد ساز شعراء کے حالات زندگی موجود ہیں مگر پاکستان میں ایسے لوگ کتنے فیصد ہیں جو ان سے استفادہ کر سکیں؟ اردو پڑھنے والے نوے فیصد لوگ ان زبانوں سے ناآشنا ہیں۔بے حد ضروری تھا کہ اردو زبان میں ان شعراء کے حالات زندگی کو بیان کیا جائے تا کہ ان کے کلام کو بہتر انداز میں سمجھا جا سکے اور لطف اندوز ہوا جا سکے۔یہ مشکل اور مبارک کام حسن عباسی نے سرانجام دیا ہے۔عہد ساز شعراء کی شخصیت اور شعروں کی لطافت سمجھنا عام ادیب کے بس کی بات نہیں ہے مگر چونکہ حسن عباسی بذات خود ایک خوش نوا مقبول شاعر ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ مدیر ارژنگ بھی ہیں۔اس لئے انہوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ یہ اہم کام سرانجام دیا ہے۔کوزے میں دریا کو بند کرنے والے محاورے کی عملی تفسیر دیکھنا مطلوب ہو تو سات عظیم فارسی شعراء کے دلچسپ حالات کا مطالعہ فرمائیں۔حسن عباسی کی نثر میں شاعرانہ موسیقیت ہے جس نے ان عظیم شعراء کے حالات زندگی پڑھنے کا مزہ دوآتشہ کر دیا ہے۔تحریر میں ایسی روانی اور انداز بیان ایسا دلچسپ ہے کہ کتاب مکمل پڑھے بغیر چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔یہ کتاب پاکستانی قوم اور اردو زبان کے قارئین کے لئے ایک انمول تحفہ

ہے جس پر میں حسن عباسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ان کی تحقیق کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہے جو کہ کسی بھی محقق اور لکھاری کے لئے ایک خوشی اور تمانیت کا موقع ہوتا ہے لہذا میں سات عظیم فارسی شعراء کے دلچسپ حالات زندگی کی اشاعت پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عامر بن علی کا ادبی سفر

محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)

گزشتہ دس برسوں میں نوجوان شعراء کی جونسل ابھر کر سامنے آئی ہے۔اس میں سے ایک اہم نام عامر بن علی کا ہے۔اس کی شاعری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ ثقہ اور معتبر ادبی حوالوں سے بھی لائق توجہ اور پسندیدہ ہے۔

(امجد اسلام امجد)

ادب سے عامر بن علی کی کمٹمنٹ ہے اور یہی کمٹمنٹ اسے کچھ کر گزرنے کے عمل پر اکساتی رہتی ہے اور بے چین رکھتی ہے۔نفرت اور منافقت سے آلودہ موجودہ ادبی فضا میں ایسے شاعروں کا وجود غنیمت ہے جو نہ صرف شاعری میں محبت اور پیار کی بات کرتے ہیں بلکہ خود اسکی عملی تصویر بھی ہیں۔

(عطاء الحق قاسمی)

چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)

عامر بن علی کی غزلوں میں بھی ان کی ذہانت اور حساسیت جگہ جگہ نمایاں ہے مگر ان کا حقیقی تخلیقی جوہر ان کی نظموں میں اظہار پاتا ہے۔وہ جدید نسل کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کے کلام میں امکانات کے آفاق خاصے وسیع ہیں۔

(احمد ندیم قاسمی)

عامر بن علی کومل، معصوم اور سچے جذبوں کو سادگی اور سلاست کے ساتھ شعری پیکر عطا کرنے کے خوابیدہ عمل میں سرشار ہیں۔ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی لطافت اور نغمگی ہے جو قاری یا سامع کے دل و دماغ پر پھوار کی طرح برستی ہے۔پھر دھیمے دھیمے انداز میں سلگاتی چلی جاتی ہے۔

(اسلم کولسری)

سرگوشیاں (شعری مجموعہ)

عامر کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ "سرگوشیاں" اپنے عنوان کی طرح سبک، مدھم اور نرم و نازک جذبات و خیالات سے مزین ہے۔ان نظموں سے ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنے والی نوجوان نسل کو تلاش کرنے اور اسے سمجھنے اور پیار کرنے کی دعوت ملتی ہے۔

(منّو بھائی)

عامر بن علی زندگی کے غبار آلود راستے پر ہمہ وقت سفر کرنے والا ایک نوجوان ہے۔انتھک، باعمل اور اچھے برے موسموں میں سر اٹھا کر چلنے والا نوجوان۔اس نے اس سفر میں آنے والے ہر چھوٹے بڑے مشاہدے اور تجربے کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب رہا ہے۔

(احمد عقیل روبیؔ)

آج کا جاپان (سفر نامہ)

آپ کے سامنے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو سفر نامہ نہیں، تحقیقی مقالہ بھی نہیں بلکہ ''آج کا جاپان'' ایک تجربہ نامہ ہے۔ مصنف نے جاپانی معاشرے کو اس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خو آزمایا۔ پھر ایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کو عمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔ اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسریسفر ناموں سے منفرد ہے۔

(پروفیسر سو یامانے)

اس کتاب کی پاکستانی معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔شاید اس کے مطالعے سے چند افراد کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں بھی اپنے ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزنکرنے کے لیے جاپان سے کچھ سیکھنا ہے۔اس کتاب میں سفر نامہ اور قیام نامہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کیا گیا ہے اور رواں، سلیس، ہلکی پھلکی نثر میں بہت کام کی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

(خواجہ محمد زکریا)

گفتگو (انٹرویوز)

عامر بن علی اور ابرار ندیم کی انٹرویوز پر مشتمل کتاب میں آپ کو گہرائی اور گیرائی نظر آئے گی۔اس کی نظیر ان کے ہم عصروں میں بہت کم کم نظر آتی ہے۔

(عطاء الحق قاسمی)

گفتگو ایک اہم ادبی دستاویز ہے جو ادب کے قارئین کے لئے حوالے کی چیز ثابت ہوگی۔

(ڈاکٹر سلیم اختر)

محبت کے دو رنگ۔۔۔گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (تراجم)

عامر بن علی نے ایک طرف پابلو نرودا جیسے عظیم مزاحمت کار کی منتخب شاعری کا ترجمہ پیش کر دیا ہے وہاں نرودا کے سیاسی اور ادبی مسلک کے مدمقابل عالمی شہرت یافتہ گبریلا مسترال کے تراجم بھی پیش کر دیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ شعر و ادب میں دونوں غالب مگر مدمقابل رنگوں کو محبت کے ساتھ محسوس کیا جائے، یہ پہل عامر بن علی نے کی ہے اور نام رکھا ''محبت کے دو رنگ''

(ڈاکٹر انوار احمد)

یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)

یہ مجموعہ نئی نظموں کا نمونہ ہے۔اس کی نظم جدید نظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ن۔م راشد اور میرا جی سے علیحدہ رجحان کا پتہ دے رہی ہیں۔بعض اوقات چونکا بھی دے رہی ہے۔

(شہرت بخاری)

روبرو (انٹرویو)

روبرو عہد حاضر کے نامور دانشوروں اور صحافی شخصیات کے انٹرویو پر مشتمل ہے۔مختلف ادبی اور علمی شخصیات سے گفتگو میں ادب کے کئی نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔ادبی مسائل کے علاوہ کئی شخصیات کی

ذاتی زندگی بھی پڑھنے کوملتی ہے۔ یہ انٹرویوز عامر بن علی،حسن عباسی اورلبنیٰ صفدر نے کئے ہیں۔جن سے ان کے ذہن کے دریچوں میں جھانک کر انکے خوبصورت خیالات واحساسات جاننے کا موقع ملتا ہے۔ان انٹرویوز میں مختلف کےلوگ شامل ہیں۔شاعر،ادیب اورصحافی۔لہٰذا یکسانیت کا ماحول نہیں ہے۔ بلکہ ایک رنگا رنگی ہے۔اپنے اپنے میدان کے شہ سواروں نے اپنی کامیابی اورسفر کی دلچسپ داستانیں بیان کی ہیں۔

(روزنامہ جنگ)

Selected Poems of Amir Bin Ali

Amir Bin Ali is one of the finest poets from the younger Generation that Have emerged during the last Decade.

(Express Tribune Book Review)

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu poetry. He has always been a globetrotter filled with passion for travelling. Wandering all around the globe in search of New Sights and Experiences. He has written four poetry books and two Travelogoes.along with his books of interviews with Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is expert in Seven International Language.

(Daily Times Book Review)

جہاں گردی (سفرنامہ)

عامر بن علی نگرنگر گھومنے والا ایسا سیاح ہے جو ہر لمحہ ہر منظر کولفظوں میں قید کر لیتا ہے۔اس کی نظر سرسری نہیں ہوتی، بلکہ بہت عمیق ہوتی ہے۔۔ جو صدیوں کو کھنگال لیتی ہے،عامر بن علی ان شاعروں اورادیبوں میں شامل ہے جو صاحب مطالعہ ہیں۔اس کی اضافی خوبی اس کا ہفت زبان ہونا بھی ہے۔ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں لوگ حیرت زدہ رہ گئے جب اس نے روانی کے ساتھ روسی زبان میں تقریر کی۔ جہاں گردی ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں اس نے ہر قسم کے پھول شامل کرر کھے ہیں۔۔۔الگ الگ رنگوں اورالگ الگ خوشبوؤں والے۔اس کے مہکتے لفظوں نے ایک انجمن سجا رکھی ہے۔

(نیلما ناهید درانی)

نگر نگر اِک نظر (سفرنامہ)

میری عامر بن علی سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ابھی طالب علم تھا۔اس لحاظ سے ہم فیلو اولڈ راوین بھی ہیں اور میں مجلّہ ''راوی'' کا ایڈیٹر بھی رہا ہوں۔زمانہ طالب علمی سے ہی عامر بن علی کو لکھنے کا بہت شوق تھا۔اس کی پہلی دونوں کتابیں تو کالج یونیورسٹی کے زمانے میں ہی شائع ہوگئی تھیں۔گرچہ وہ سائنس کا طالب علم تھا اور پھر اس نے ایم۔بی۔اے کیا،مگر تب بھی وہ کالج کے میگزین کا سب ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر تھا۔نگر نگر اک نظر اس کا تیسرا سفرنامہ ہے۔یہ سفرنامہ بھی قارئین کی امیدوں پر نہ صرف پورا اترے گا بلکہ پاکستانی ادب میں ایک بیش قیمت اضافے کا موجب بنے گا۔

(اسد اللہ غالب)

عامر بن علی ہمہ جہت صفات کے مالک ہیں،دھیمے لہجے میں بولنے والے نرم رو اور انتہائی منکسر المزاج شخص ہیں۔نہ گلہ شکوہ نہ دوسروں کے معاملات پر گفتگو کرتے ہیں۔بعض اوقات تو منفی باتوں کو بھی خوش اسلوبی سے مثبت رُخ سے دیکھتے اور برداشت کرتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ادبی کام پر بھرپور توجہ فرماتے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ اُن کو انسانی رویوں کا احساس نہیں ہے۔آپ ان کے سفرنامے پڑھیں تو نہ صرف ماحول کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ انسانی رویوں کے اُتار چڑھاؤ کو بھی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ میں نے اس سے قبل ان کے دو سفرنامے " آج کا جاپان "اور "جہاں گردی" پڑھ رکھے ہیں۔دونوں سفرنامے نہ صرف عمدہ اور جداگانہ اسلوب لئے ہوئے ہیں بلکہ معلومات سے بھرپور بھی ہیں۔ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مجھے عامر بن علی کے سفرنامے پڑھنا اچھا لگتا ہے۔حال ہی میں " نگر نگر اک نظر" پڑھنے کا موقع ملا۔آپ اس کو مختلف تحاریر کا گلدستہ کہہ سکتے ہیں۔

(لبنیٰ صفدر)

مشرق کی طرف دیکھ (سفرنامہ)

عامر بن علی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی ہی نہیں پیا، ان اجنبی بستیوں کی کہانیوں سے بھی جھولی بھر لی ہے۔ عامر کے پاس کمال کی بدیشی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کی خاصیت یہ ہے کہ کسی بھی جگہ کے ایک آدھ دن کے ہنگامی دورے کے بعد لکھی گئی پانچ سو صفحے کی کتاب کی بجائے سالہا سال ان ممالک میں رہنے، ان کی زبان سیکھنے، ان کی ثقافت کو سمجھنے اور ان کے ساتھ کاروبار کرنے کے بعد کہی جاتی ہیں۔ ابھی ہم عامر کی کہانیوں کے طلسم میں ہی گم تھے کہ ان کی کتاب، مشرق کی طرف دیکھ موصول ہوئی۔ کتاب کا عنوان دیکھ کر یورپ میں جگہ جگہ لگے کولمبس کے مجسمے یاد آ گئے جس میں وہ مشرق کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا ہے۔ عامر بھی چھوٹے موٹے کولمبس یا کم سے کم مارکو پولو تو نکلے ہی۔

(آمنہ مفتی)

100 تخلیق کار (انٹرویوز)

پیشِ نظر کتاب میں ادبی دنیا کے 100 تخلیق کاروں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ انہوں نے گذشتہ تین دہائیوں پر محیط عرصے میں انٹرویوز کیے جو ارژنگ میں چھپتے اور داد و تحسین سے نوازے جاتے رہے۔ اب کتابی صورت میں انہیں شائع کیا جا رہا ہے۔ عامر بن علی کے سوالات بلند علمی سطح کے آئینہ دار ہیں اور پھر 100 ادبی شخصیات نے جو اُن کے جوابات دیئے اُس سے ان شخصیات کی ذاتی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ تین دہائیوں کے ادبی رجحانات کا بھی احاطہ ہو گیا ہے۔ اس کام پر عامر بن علی کو جتنی داد دی جائے کم ہے۔

(عباس تابش)

تمہی کو ہم نے چاہا تھا (انتخابِ غزل)

عامر بن علی سنجیدہ فکر کا نوجوان شاعر ہے جس کی کومل جذبوں پر مشتمل شاعری مجموعے کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ اس شعری انتخاب میں شاعر کی آنکھ نے اردو شاعری کے ڈھیر سے غزلیات کو چنا ہے، ہنرمندی کے ملبوس میں وہ بڑی کومل کومل نظر آ رہی ہیں۔

(احمد عقیل روبی)

Sakura & Spice: A Pakistani's Journey through Japan

The Book you have before you is a collection of essays, a memoir, a Travelogue. The author has seen the Japanese society Very well, living inside for a Decade Gave him a Deep Insight & Extensive Experience. Also, by being associated with journalism for a long time, he has the experience & Expertise of writing Quality articles. I think this book is unique, Very Different from other travel books.It is also characterized by the fact that its author, Amir Bin Ali, lives most of the time in a city in Japan,where there are not many foreigners like Tokyo and Osaka, and it snows a lot in winter. By living in such a city, He definitely had the opportunity to see the traditional society of Japan. Amir has been writing various things from time to time in Newspapers about Japan & now We have a Complete book.۔

Professor So Yamane

Department of Urdu, Osaka University Japan

لاطینو (سفرنامہ)

یہ لاطینی امریکہ کے بارے میں پہلاسفرنامہ ہے جوکہ اردوزبان میں شائع ہواہے۔اپنے موضوعات اورطرزِتحریرکے اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔سنگِ میل پبلی کیشنز نے نہایت معیاری انداز میں اسے شائع کیاہے۔

(روزنامہ ایکسپریس)

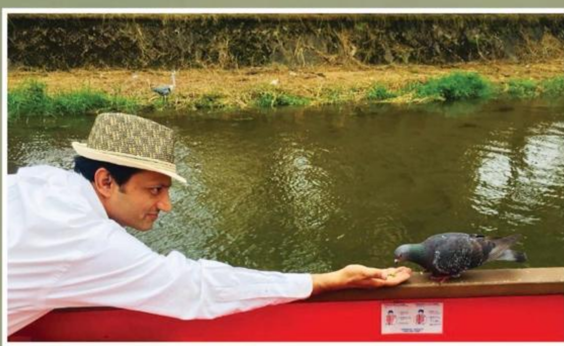

Rs.0000.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-3790-4
ISBN-13: 978-969-35-3790-1
9 789693 537901

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور